جلد ۶۷
جولائی ۱۹۶۷ء
عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ: سات روپے
قیمت فی پرچہ: ۷۵ پیسے

اسلامی ریاست

(نظرثانی اور اضافوں کے بعد نیا ایڈیشن)

اسلام کے نظریۂ سیاسی
اور نظامِ ریاست پر
مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ
کی عظیم تالیف:

مضامین ایک نظر میں:

- اسلام کا فلسفۂ سیاست
- اسلام کا نظامِ مملکت
- اسلامی دستور کے حقیقی خدوخال
- اسلامی دستور کی بنیادیں اور اس کے مآخذ
- اجتہاد اور اس کے شرائط و حدود
- عصرِ جدید میں اسلامی ریاست کو چلانے کیلئے طریق کار

اسلام کے سیاسی

دستوری اور مملکتی نظام پر ایک مکمل اور مستند دستاویز

• یونیورسٹیوں میں سیاسیات و قانون کے طلباء اور محققین کے لئے ایک رہنما کتاب

آفسٹ کی نفیس طباعت:
صفحات: ۴۲۴
اعلیٰ ایڈیشن مجلد گرد پوش ـــــ ۱۶ روپے
سستا ایڈیشن: ۱۰/۵۰

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳- ای۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۵	جولائی سنہ ۱۹۶۷ء	جلد ۶۷

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵۔اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ، لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اینگلو امریکن بلاک کی روایتی اسلام دشمنی اور روس کی بر وقت غداری سے مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو زبردست نقصان ہُوا ہے، اُس کی داستان اتنی دلفگار اور المناک ہے کہ الفاظ اُسے بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسلام دشمن طاقتیں برسوں سے اپنے سینوں میں مسلمانوں کے خلاف ناپاک عزائم پال رہی تھیں اور اس غرض سے وہ بڑی دیر سے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت ایسے حالات پیدا کر رہی تھیں کہ مشرقِ وسطیٰ میں اسلام اور مسلمان یکسر نیست و نابود ہو جائیں۔ چنانچہ یہ جو کچھ ہُوا ہے اسے کسی وقتی اور اتفاقی حادثے پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت عمل میں لایا گیا۔

مغرب کے نصاریٰ صلیبی جنگوں ہی سے اسلام کے خلاف اپنے دلوں میں ایک شدید نفرت رکھتے چلے آرہے تھے اور انہیں مسلمان فاتحین، خصوصاً سلطان نورالدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں جو شکستیں کھانا پڑی تھیں اُن کا انتقام لینے کے لیے مناسب مواقع کی تلاش میں تھے۔ جب تک مسلمان دنیا کی ایک ناقابلِ تسخیر قوت رہے اس وقت تک تو یہ لوگ دبک کر بیٹھے رہے لیکن جونہی وہ زوال کے شکار ہوتے ان اسلام دشمن طاقتوں نے ان کو زک پہنچانے، انہیں تباہ و برباد کرنے اور انہیں دنیا سے مٹانے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

جنگِ عظیم اوّل سے پہلے شمالی عرب پر عثمانی حکومت کا قبضہ تھا۔ شام، عراق، لبنان اور

فلسطین ترکی کے ماتحت تھے۔ برطانیہ نے سب سے پہلے تو عربوں اور عثمانیوں کے درمیان دشمنی کی آگ بھڑکائی اور خود عربوں کا مونس اور غمخوار بن کر انہیں عثمانی حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ پھر جنگ میں جب جرمنی کو شکست ہوئی اور ترکی جو اس کا ہمنوا تھا اُس کی کمر بھی ٹوٹ گئی تو برطانیہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنتِ عثمانی کے حصے بخرے کر دیئے۔

برطانیہ کی نظر جنگ شروع ہونے سے بہت پہلے یہودیوں کے مال پر لگی ہوئی تھی۔ اُس نے اُن سے مالی امداد حاصل کرنے کے لیے انہیں اس امر کا یقین دلایا کہ وہ اگر جنگ میں برطانیہ کی بھرپور امداد کریں تو وہ انہیں ایک الگ خطۂ ارضی کے حصول میں مدد دیگا۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ کے اختتام پر جب ترک پورے عرب سے نکل گئے اور فلسطین ایک برطانوی نو آبادی کی طرح برطانیہ کے زیرنگیں ہو گیا تو وہاں ایک صہیونی ریاست کے قیام کے منصوبے بننے لگے اور یہودی تمام ممالک سے آکر اس خطے میں آباد ہونے لگے۔ مگر عربوں کی زبردست مزاحمت کی وجہ سے ان کی کوئی ریاست قائم نہ ہوسکی۔

دوسری جنگِ عظیم نے حالات کا رُخ بالکل بدل دیا۔ یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کی داستانیں سنا سنا کر ایک طرف تو جرمنی کے خلاف جذبۂ نفرت وحقارت اُبھارا گیا اور دوسری طرف یہودیوں کی مظلومیت کا چرچا کر کے اُن کے لیے ایک الگ وطن کے قیام کے لیے فضا ہموار کی جانے لگی۔ ۱۹۴۷ء میں جب برطانیہ نے فلسطین سے حتمی دستبرداری کے بعد اُسے اقوامِ متحدہ کے حوالہ کر دیا تو جنرل اسمبلی نے صرف دس ہفتوں کے اندر یہ سرزمین عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کر دی۔ عربوں نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن مغربی طاقتیں چونکہ اس خنجر کو مسلمانوں کے سینے میں پیوست رکھنے پر مُصر تھیں اس لیے آخر کار مئی ۴۸ء میں فلسطین کے ایک بڑے حصے پر یہودی ریاست قائم کر دی گئی۔ عربوں نے تلوار کے زور سے اس غاصبانہ تسلط کو روکنے کی کوشش کی اور آٹھ مہینے تک اس کے خلاف برسرِپیکار رہے، مگر مغربی طاقتوں نے یہودیوں کو روپے اور ہتھیاروں سے اتنی مدد دی کہ عربوں کی اُن کے

سامنے کچھ پیش نہ جا سکی اور وہ فلسطین کے آٹھ ہزار مربع میل علاقے پر قابض ہو گئے۔

یہودی غاصبوں کا مقصد اس جنگ سے صرف اتنا ہی نہ تھا کہ وہ ملک پر قبضہ کریں، بلکہ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے مقبوضہ علاقے سے عربوں کو نکال باہر کریں اور ان کی جگہ یہودیوں کو لا کر آباد کریں۔ چنانچہ انہوں نے عربوں کے ساتھ ٹھیک وہی کچھ کیا جو نازیوں نے تین چار برس پہلے خود ان کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے عربوں کا بے دریغ قتلِ عام کیا۔ عورت، مرد، بچے، بوڑھے، کسی پر رحم نہ کھایا۔ اور دس لاکھ فلسطینیوں کو، جو صدیوں سے اس علاقے میں آباد تھے، سخت ظلم و ستم کے ساتھ جلاوطن کر دیا۔ مگر یہ عجیب ماجرا ہے کہ جو اہلِ مغرب یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کا دنیا بھر میں ماتم کر رہے تھے، وہ عربوں پر یہودیوں کے بالکل وہی مظالم دیکھ کر ذرا اس سے مس نہ ہوئے، بلکہ اُلٹے ان کی بہادری پر داد دینے لگے۔ انہیں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ احساس نہ ہوا کہ دس لاکھ عرب اسی بدبخت اسرائیل کی وجہ سے گذشتہ انیس سال سے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ان کے گھربار تباہ ہوئے۔ اُن کی عزتیں لٹیں، ان کی زمینیں غصب ہوئیں، مگر جانسن، ولسن یا ان کے پیش روؤں میں سے کسی ایک کے دل میں بھی انسانی ہمدردی کی کوئی لہر نہ اٹھی۔ ان حق ناشناسوں کو کبھی یہ خیال نہ آیا کہ دس لاکھ عرب بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

پھر مغربی قوموں کا یہودیوں کے بارے میں احساسِ مروت و ہمدردی بھی بڑا عجیب ہے کہ ان کی حالتِ زار پر ترس کھاتے ہوئے انہیں خود اپنے وسیع و عریض مقبوضات میں تو ایک انچ زمین بھی نہ دی مگر انہیں ایک دوسری قوم پر لا کر مسلط کر دیا تاکہ وہ اسے گھر سے بے گھر کر کے اس کی جگہ خود بس جائیں۔ اُن کی نگاہ میں فلسطین بائبل کی سرزمین ہے اور وہ اسے تاریخی طور پر یہودیوں کا وطن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس سرزمین سے یہودیوں کا آخری اخراج دو ہزار سال پیشتر رومیوں کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ اس وقت سے عرب یہاں آباد رہے۔ چودہ سو سال پہلے جب مسلمان

فلسطین پہنچے تو یہود کا یہاں نشان تک موجود نہ تھا۔ لیکن مغرب کی سامراجی قوتوں کو چونکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید پرخاش ہے اور انہیں صرف انہیں مٹانا مقصود ہے اس لیے انہوں نے اس خنجر کو مشرقِ وسطیٰ کے قلب میں پیوست کرکے چھوڑا اور اب حق و انصاف کے ہر تقاضے کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے وہ اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

مغربی سامراج نے جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کے برباد کرنے کے وسیع پروگرام کا ایک ضروری حصہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اہلِ مغرب نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اب ان کے لیے مشرقی ممالک اور خاص طور پر مسلمان ممالک کو براہِ راست اپنی غلامی میں رکھنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ انہیں نئی ابھرنے والی طاقتوں کی طرف سے جو خطرات پیش آسکتے تھے اُن کی نوعیت کا بھی ان کو اندازہ ہوچکا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی جب کبھی مسلمانوں کو اسلام کے نام پر پکارا جاتا ہے وہ فوراً سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔ اس نام ہی سے ان کے اندر اتفاق و اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ مغرب کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے بھی انہیں صرف اسلام ہی نے بیدار کیا اور قوت فراہم کی۔ ان سارے خطرات کو پوری طرح بھانپتے ہوئے مغربی سامراج نے ایک جامع منصوبہ تیار کیا جو مندرجۂ ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

- مشرقِ وسطیٰ میں، جو دنیائے اسلام کے لیے قلب کی حیثیت رکھتا ہے، اسرائیل کا سرطان پیدا کر دیا جائے۔ مغربی طاقتوں کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ اسرائیل اپنے وجود کے لیے ہمیشہ ان کا دست نگر رہے گا اور اس طرح اسرائیل کی حمایت کی آڑ میں ان سامراجی طاقتوں کو مشرقِ وسطیٰ کے مسائل میں براہِ راست دخیل ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔
- کسی نہ کسی طرح اسلام کے مقابلے میں کسی دوسرے نظریۂ حیات کو خود مسلمان ملکوں کے اندر پروان چڑھایا جائے اور اس مقصد کے لیے مغربی الحاد اور اشتراکیت دونوں کو مسلط کرنے کا انتظام کیا جائے۔ جن لوگوں کو مغربی الحاد سے دلچسپی ہو اور وہ امریکہ برطانیہ

اور فرانس کی طرح مذہب سے بیگانہ ہو کر اباحیت کی زندگی بسر کرنے میں دلکشی محسوس کرتے ہوں اُن کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی اسی غرض کے لیے کام کر رہی ہے۔ لیکن جو لوگ برطانیہ اور امریکہ کے مظالم کی وجہ سے براہ راست ان کے اثر میں نہ آسکیں اُن کے لیے اشتراکیت کے نسخہ کو آزمایا جائے۔ ان قوموں کا مقصد صرف ایک ہے کہ یہاں کسی طرح اسلام ختم ہو خواہ یہ کام مغربی الحاد کے ذریعہ سے انجام پائے یا اشتراکیت کے ذریعہ سے —————— اسلام کے معاملے میں امریکہ، برطانیہ فرانس اور روس سب پوری طرح متفق ہیں۔ ایک امریکی اور ایک برطانوی اشتراکیت کو تو گوارا کر سکتا ہے مگر اسلام کو کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک اشتراکی کے لیے سرمایہ دارانہ الحاد تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے مگر خدا پرستانہ اسلام کو وہ پنپتے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ مغربی طاقتوں کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ اسلام کے ختم ہو جانے کے بعد پھر یہ مسلم حکومتیں خواہ اشتراکیت کی علمبردار بنیں یا سرمایہ داری کی، لیکن ان میں زندگی کی حرارت اور حرکت بالکل ختم ہو جائے گی۔ اس بنا پر وہ مغرب کے لیے کسی خطرے کا موجب نہ رہیں گی۔

- ان ممالک میں رائے عام کو کبھی پروان نہ چڑھنے دیا جائے بلکہ سخت گیر آمروں کو عوام کا ہیرو بنا کر ان کی گردنوں پر مسلط کیا جائے اور انہیں اس بات کی شہ دی جائے کہ وہ عوام کے منشا اور مرضی کے خلاف زبردستی اُن پر مغربی الحاد ٹھونسیں یا اشتراکیت۔ چونکہ اشتراکیت سرمایہ داری کی نسبت ابھی زیادہ انقلاب انگیز قوت ہے اس لیے جو لوگ سوشلزم کا نعرہ بلند کریں اُن کی پوری طرح حوصلہ افزائی کی جائے۔
- دنیائے اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے مسلم ریاستوں میں قومیت پرستی کی تحریک کو ابھارا جائے۔
- مسلمان ممالک کو معاشی اعتبار سے اس قدر مفلوج کر دیا جائے کہ اپنے وسائل کے بل بوتے پر نہ تو انہیں جینے کی ہمت ہو سکے اور نہ ایسا کرنے کے انہیں ڈھنگ ہی آئیں۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں مشرقِ وسطیٰ کی اس کشمکش کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کشمکش کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان ممالک مغرب کے ان ناپاک عزائم کو اچھی طرح سمجھتے اور انہیں ناکام بنانے کے لیے سر توڑ کوشش کرتے۔ لیکن افسوس کہ جس دام میں انہیں مغرب کے شکاری لانا چاہتے تھے وہ ہنسی خوشی اس میں آ گئے اور سارے وہ کام کیے جو انہیں اپنی تعمیر و ترقی کی طرف لے جانے کی بجائے تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والے تھے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آدمی دنیا میں ہر چیز کا سامنا کر لیتا ہے مگر حقیقت، آئینہ اور ضمیر کا سامنا نہیں کر سکتا۔ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنا جائزہ یا اپنا احتساب ہے۔ گریبان میں منہ ڈالنا کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں بلکہ یہ ایک بڑی ہی دشوار اور کٹھن منزل ہے جس سے بڑے بڑے لوگ کانپ اٹھتے ہیں۔ انسان کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی ناکامیوں اور بربادیوں کو دوسرے کے سر تھوپ کر بری الذمہ ہونا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خارجی عوامل کسی فرد یا قوم کو بسا اوقات شدید نقصان پہنچا دیتے ہیں لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ عوامل اُسی صورت میں زیادہ مؤثر ہوتے ہیں جب داخلی کمزوریوں نے کسی فرد یا قوم کے قویٰ کو بالکل مضمحل کر دیا ہو۔ یہی بات مشرقِ وسطیٰ کی اس بربادی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ نے بلاشبہ حق و انصاف کا خون کیا ہے۔ روس نے بلاریب عین وقت پر غداری کی ہے۔ اسرائیل نے یقیناً بڑی سفاکی اور درندگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن کیا یہ مسلمان ممالک اپنے ضمیر کے سامنے اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اس بربادی میں ان کا اپنا کوئی حصہ نہیں اور یہ سراسر غیروں کی زیادتیوں اور ریشہ دوانیوں ہی کا نتیجہ ہے؛ بیرونی سازشیں کسی فرد یا قوم کا بال تک بیکا نہیں کر سکتیں اگر اُس کے داخلی حالات اُن سازشوں کے لیے سازگار نہ ہوں۔

اِس بربادی پر جس قدر تبصرے بھی دیکھنے میں آئے ہیں اُن میں شاہ مراکش کا تبصرہ ہمیں سب سے زیادہ صحیح، مناسب اور حقیقت افروز معلوم ہوا ہے جس میں انہوں نے کھل کر کہا ہے کہ:

"عربوں کو مشرقِ وسطیٰ کی جنگ میں اپنے نفاق، غلط کاریوں اور گناہوں کے باعث شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ خدا نے ہمیں ہمارے اعمالِ بد کی سزا دی ہے اور ہمیں خبردار کیا ہے کہ اگر ہم آپس

میں متحد نہ ہوتے اور ایک دوسرے کی تذلیل سے باز نہ آئے تو اس کا نتیجہ بجز تباہی و بربادی کے اور کچھ نہ ہوگا۔ چونکہ ہم میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی اس لیے ہمیں دشمن کے مقابلے میں ناکامی ہوئی۔ ارشاد خداوندی یہ تھا کہ ہم ایک دوسرے پر کیچڑ نہ اُچھالیں۔ لیکن اس کے برعکس ہم زبان اور تحریر کے ذریعے بارہا ایک دوسرے کی توہین کے مرتکب ہو چکے تھے۔ ارشادِ ربانی یہ تھا کہ ہم اس کے فرمانوں سے روگردان نہ ہوں اور اپنا ضابطہ حیات اس کی ہدایات کے مطابق مرتب کریں مگر ہم نے خدا کے اس حکم کو پسِ پُشت ڈال دیا۔ ہم اللہ سے اپنے رشتے توڑ چکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس نے بھی ہم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ہے۔"

قرآن و سنت کے مطالعہ اور گذشتہ اقوام کے حالات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ دنیا میں قوموں کی عزت و سربلندی اور ذلت و رسوائی کے کچھ اصول ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا اصول یہ ہے کہ غیور اور قادرِ مطلق ذات نے جب چاہا انتہائی کمزور اور بے سہارا لوگوں سے اپنے دین کی خدمت کا کام لے لیا۔ لیکن اُس نے اپنے نام لیواؤں کو کبھی بھی دین کا باغی بن کر دنیا میں پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ جن قوموں نے اس کے دین سے یکسر انحراف کر کے اپنی زندگی کی تعمیر خالص کفر و انکار کی بنیادوں پر کی اُن کے لیے تو اس کی سنت یہ رہی ہے کہ دنیا کی جو قوم بھی مادی اسباب کی فراہمی، حالات کے مطالعہ میں تدبر و تفکر، اور افراد کے مابین اتفاق و اتحاد اور ضبط و نظم میں دوسروں پر جس قدر سبقت لے جاتی ہے وہ ان قوموں پر غالب آجاتی ہے جو کفر میں یکساں ہوں مگر اِن صفات میں اس سے کم تر ہوں۔ البتہ وہ قومیں جو اس کے دین کی سچے دل سے مطیع و پیرو اور خادم و علمبردار رہیں اُن کے لیے اس کا خاص ضابطہ یہ رہا ہے کہ مادی اسباب و وسائل کی کمی کا تدارک وہ بسا اوقات اپنی تائیدِ خاص سے کر دیتا ہے اور بے سروسامانی کے باوجود انہیں دین کے دشمنوں پر فتح عطا فرماتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ اُس نے اپنے نام پر کبھی دنیا میں کھوٹے سکوں کو چلنے نہیں دیا ہے۔ کوئی قوم مسلمان ہونے کے باوجود نہ اسلام کی پیروی

کرے، نہ اسلام کے لیے کام کرے، اور پھر مادی اسباب و وسائل کے اعتبار سے بھی ہر طرح کفار کے مقابلہ میں ہیٹی رہے۔ تو آخر اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اسے اپنی تائیدِ خاص سے نوازے؟

ہم جب ان دونوں اصولوں کے تحت مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ ہمارے لیے ان دردانگیز حالات کو دُہرانا بہر حال کوئی خوشگوار کام نہیں ہے۔ یہ اپنے ہی زخموں کے ٹانکے کھولنا ہے۔ مگر انہیں بیان کرنے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ہماری قوم حقائق کو پہچان سکے اور اُس سے جو کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں اُن کی اصلاح کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کرے۔ اُس فوج کے جیتنے کے کوئی امکانات نہیں ہوتے جو میدانِ جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد اپنے مورچوں، اپنے اسلحہ اور اپنی جنگی مہارت کا جائزہ لے کر ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ ان کے ذکر پر اُلٹا بُرا ماننے لگے۔

ہم سب سے پہلے دینی نقطۂ نظر سے ان ممالک کے حالات پر غور کرتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے سارے ممالک میں اس وقت سب سے زیادہ طاقتور مصر ہے لیکن اس بدنصیب ملک کے فرمانرواؤں نے گزشتہ چند سالوں سے اسلام کا حلیہ بگاڑنے اور اس کی جگہ غیر اسلامی تہذیب کو فروغ دینے اور غیر اسلامی نظریات کو باہر سے لا کر ایک مسلم معاشرے پر مسلّط کرنے کے لیے جو ظلم و زیادتی کی ہے، پوری دنیا اس کی شاہد ہے۔ اس شخص نے ہر وہ کام کیا جو خدا کی رحمت کو دعوت دینے کے بجائے اُس کے غضب کو انگیخت کرنے والا تھا۔ اُس نے اسلام کے وسیع اور ہمہ گیر رشتۂ اخوت کو توڑ کر عرب قومیت کا نعرہ بلند کیا۔ قرآن حکیم نے ہمیں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی ہے کہ وللہ العزۃ ولرسولہ لیکن اس شخص نے رسول کی جگہ عرب قومیت کو دے دی اور یہ کہنا شروع کیا العزۃ للہ و للقومیۃ العربیۃ۔ بعض جگہ تو باری تعالیٰ کو بھی نظرانداز کر کے پوری قوم کو صرف عرب

قومیت کا بُت پُوجنے کی تلقین کی۔خدا اور اُس کے رسُول سے بغاوت میں وہ اور اس کے اعوان اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے کہ اسرائیل اور عربوں کے مابین تصادم کے دنوں میں بھی ان لوگوں کے جو بیانات، خطبات اور تقاریر ریڈیو پر نشر کی جاتی تھیں ان میں خدا اور رسول یا دین اسلام کا نام تک نہ آتا تھا۔عرب قومیت، عرب وطنیت، عرب افواج اور ملکی وسائل ہی کا وظیفہ بار بار پڑھا جاتا تھا اور اس سے بڑھ کر یہ ایک خطبہ کا افتتاحی جملہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ باسم القومیۃ العربیہ اور باسم الکرامۃ العربیہ تھا۔

اب جبکہ مصر اور تمام مشرقِ وسطیٰ نے اس جنگ میں زبردست زک اٹھائی ہے، پھر بھی اس شخص کی آنکھیں نہیں کھلیں۔اس نے اس سانحہ کے بعد اپنا استعفا پیش کرتے ہوئے جو پہلی تقریر نشر کی ہے اُس میں بھی عرب قوم پرستی کا بار بار تذکرہ ہے۔اور جن باتوں کی طرف اُس نے قوم کی توجہ دلائی ہے ان میں سب سے اہم تین باتیں ہیں۔

- عرب مفادات اور عربوں کے حقوق کا تحفظ ہمارا نصب العین ہے۔
- عرب اتحاد کی توقع اس وقت بھی مثل شمع فروزاں رہے گی جب جمال عبدالناصر یہاں نہ ہو گا۔
- عرب سوشلزم بدستور برقرار رہے گا۔

یہ عرب قوم پرستی اور عرب سوشلزم کی تحریک درحقیقت اسلام کی بیخ کنی ہے۔قطع نظر اس سے کہ یہ بیخ کنی بجائے خود ان کی مقصود ہو یا نہ ہو، اس کا نتیجہ بہرحال یہ ہے کہ عربوں کا دینی رشتہ دنیائے اسلام سے کٹ جائے اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم دین محمدؐ کے بجائے دین مارکس کی پیرو بن جائے۔ناصر صاحب نے کئی مرتبہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں علانیہ یہ کہا ہے کہ وہ عرب ریاستوں کو اشتراکی ریاستیں بنانے کا عزم بالجزم کر چکے ہیں۔اس کے لیے زمین ہموار کرنے کی غرض سے انہوں نے لوگوں کے

دینی احساسات کو کچلنے میں کبھی دریغ نہیں کیا اور اُن تمام عناصر کا قلع قمع کرنے میں اپنا پُورا زور صرف کر دیا جن کی وجہ سے ان احساسات کے زندہ رہنے کے امکانات موجود تھے۔

اس ضمن میں ناصر صاحب کے بعض کام تو ایسے ہیں کہ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً فراعنہ کے لاتعداد بُت بنوا کر انہیں اہم مقامات پر نصب کرنا۔ نوٹوں اور ٹکٹوں پر فراعنہ کی تصویریں چھاپنا۔ نحن ابناء الفراعنہ کا نعرہ لگانا۔ گزشتہ سال جب مصر کے مالی حالات کی رپورٹ دنیا کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئی تو اس میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بتایا گیا تھا کہ مصری دولت کا ایک معقول حصّہ فراعنہ کے بتوں کی نذر ہو رہا ہے۔ آپ مصر کے کسی دفتر میں چلے جائیے۔ آپ کو فرعون رعمسیس کی تصویر صدر ناصر کی تصویر کے پہلو میں آویزاں نظر آئے گی۔ اور یہ فرعون رعمسیس وہی ہے جسے خود مصری مورخین بھی مانتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دینے کا حکم اسی نے دیا تھا جس کی مذمت قرآن مجید میں وارد ہوئی ہے۔

مصر کے مدارس کے لیے جو نیا نصاب مرتب کیا گیا ہے اُس میں نوخیز نسلوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو اسلام کے مطابق بنانے کے بجائے انہیں مغرب کے ملحدانہ نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئی ہیں۔ قلب و نگاہ کی یہ تبدیلی صرف مغربی طرز کے دارس تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے مسموم اثرات اُن تعلیمی مراکز میں بھی پوری طرح نمایاں ہونے لگے ہیں جو کبھی دینی تعلیم کے گہوارے تھے اور جہاں نوجوان تعلیم و تربیت حاصل کر کے دین کے مبلغ اور معلم اور خطیب و واعظ بنتے تھے۔ مصر کی سب سے قدیم یونیورسٹی جامعۂ ازہر تک کے نصاب میں اسلامی نقطۂ نظر سے بعض ایسی تبدیلیاں کی گئی ہیں جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ کام کبھی دین سے کوئی معمولی تعلق رکھنے والا بھی کر سکتا ہے۔ جو لوگ اب یہاں سے تحصیل علم کر کے نکلتے ہیں انہیں اپنے مسلمان ہونے پر ناز کرنے کے بجائے فراعنہ کی اولاد

ہونے پر فخر ہوتا ہے اور وہ بڑے طمطراق سے کہتے ہیں "نحن ابناء فرعون"۔

پھر اس خطہ کی سب سے بڑی دینی تحریک، جسے ہم مشرقِ وسطیٰ کا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ سمجھتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں کہ یہ محض ایک تحریک نہ تھی بلکہ عرب ملکوں کے لیے اللہ کی رحمت تھی جس سے باری تعالیٰ نے اس خطے کو نوازا تھا، اس کا جو حشر ناصر صاحب کے ہاتھوں ہوا وہ ہمارے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا دینی المیہ ہے۔ اس تحریک کے جاں نثاروں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اُس کی یاد سے آج بھی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ کیا کوئی حکمراں اپنی بے بس رعایا پر کبھی اس قسم کے مظالم بھی ڈھا سکتا ہے۔ لیکن ناصر صاحب نے اشتراکیت کی اندھی محبت میں آنکھیں بند کر کے اس زبردست اسلامی تحریک کو بڑے جبر و استبداد کے ساتھ برباد کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مصر میں بلکہ دوسرے عرب ملکوں میں بھی کوئی گروہ ایسا باقی نہ رہا جو اس جنگ کے موقع پر اپنی قوم میں دینی جذبہ و جوش اُبھارتا اور روحِ جہاد بیدار کرتا۔ غضب یہ ہے کہ نہ جنگ سے پہلے اخوان کو رہا کیا گیا، نہ جنگ کے زمانے میں، اور نہ جنگ کے بعد۔

دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی ناصر صاحب کے کسی فعل کو شاید ہی دانشمندانہ کہا جا سکتا ہو۔ اس شخص کے دل میں صرف ایک ہی امنگ تھی کہ کسی طرح پورے مشرقِ وسطیٰ میں اُسے بلاشرکتِ غیرے قیادت کا مقام حاصل ہو اور تمام عرب ریاستیں اس کی تابع فرمان ہوں۔ اس شخص نے کبھی اپنے بھلے اور بُرے میں تمیز کرنا نہیں سیکھا۔ اپنے دوستوں کو پہچاننے اور اپنے دشمنوں سے محتاط رہنے میں یہ ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ سب سے پہلے اس نے عرب دنیا کے باہر مسلمان ممالک کی مخالفت کی اور اس کے دشمنوں کا ساتھ دیا۔ مثلاً دیکھیے۔ اس نے قبرص میں ترکوں کی حمایت کرنے کے بجائے ظالم مکاریوس کی صرف اخلاقی ہی نہیں بلکہ عملی تائید بھی کی۔ حالانکہ خالص نسلی اور مذہبی تعصب کی بنا پر وہ مسلمان ترکوں پر بدترین مظالم ڈھا رہا تھا۔ تاہم

ترکوں کے متعلق وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ عربوں کے مفاد سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے لیکن پاکستان، جس نے اپنے قیام کے بعد سے آج تک ہمیشہ ہر عربی قضیے میں سب سے آگے بڑھ کر عربوں کی حمایت و وکالت کی ہے، اور جس کا خود عربوں نے بارہا اعتراف کیا ہے، اس کے مقابلے میں بھی اس شخص نے ہمیشہ بھارت کو ترجیح دی اور کشمیر کے مسئلہ میں، جس میں پاکستان سراسر حق پر ہے، کبھی ہندوستان کے غاصبانہ قبضے کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا۔ کوئی شخص اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک کلمہ بھی پیش نہیں کر سکتا جو اس نے کشمیریوں کی آزادی کے حق میں کبھی کہا ہو۔ پھر عرب لیڈروں اور فرمانرواؤں میں سے بھی جس کسی نے اس سے ذرہ برابر اختلاف کیا اُس کے لیے اس کی زبان سے اور اس کے ریڈیو اور پریس سے گالیوں کے سوا اور کوئی چیز کبھی سننے میں نہ آئی۔ موجودہ بحران سے ایک روز پہلے تک اس کی طرف سے سعودی عرب، اردن، اور تونس کو بُرا بھلا کہا جاتا رہا۔ سعودی عرب کے حکمران کو ابو ذقنہ (ڈاڑھی والا)، تونس کے سربراہ کو ابن الیہودیہ (یہودی عورت کا بچہ) اور اردن کے فرمانروا کو سلالۃ الشیطان (شیطان کی اولاد) کے القاب سے نوازا جاتا رہا۔

پھر اس شخص نے روسی امداد کے بل بوتے پر ۱۹۶۳ء سے یمن پر چڑھائی کر رکھی ہے اور وہاں چار سال سے ۵۰۔۔۶۰ ہزار مصری فوج خود اپنے عرب (مسلمان) بھائیوں کے ساتھ برسرپیکار ہے۔ اس جنگ میں ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں عرب (مسلمان) مارے گئے ہیں اور دولت کا جو ضیاع ہوا ہے اس کا اندازہ کروڑوں نہیں بلکہ اربوں پونڈ تک پہنچ گیا ہے۔ مسلسل چار سال کی اس جنگ نے مصر اور یمن کی معیشت بالکل تباہ کر دی، جزیرۃ العرب کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک دیا، مصر کی فوجی طاقت کو اس قدر کمزور کر دیا کہ اس میں اسرائیل سے ٹکر لینے کی سکت نہ رہی، اور غضب یہ ہے کہ اسرائیل کے حملہ کے وقت تک ۵۰ ہزار مصری فوج یمن میں پڑی رہی۔ اپنی اس حماقت کے لیے کوئی دلیلِ جواز نہ ناصر صاحب پیش کر سکتے ہیں نہ وہ لوگ جو ان کے حامی بنے پھرتے ہیں۔ یہ اسی یمنی مہم کا نتیجہ ہے کہ مصر کو روس اور اُس کے ہم خیال ملکوں سے بے تحاشا امداد لینی پڑی اور وہ ان کا اتنا زیر بارِ احسان ہو گیا کہ اسرائیل سے جنگ کے موقع پر روس نے جو بے وفائی کی اس پر ناصر صاحب ایک حرفِ شکایت بھی زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس وقت مصر کی معاشی حالت یہ ہے کہ

اس کی روئی اور سویز کی پوری آمدنی روس کے ہاتھ میں رہن ہے۔

مصر کے بعد مشرقِ وسطیٰ کا دوسرا طاقتور ملک شام ہے۔ اس بدنصیب ملک پر اس وقت بعث پارٹی کی حکومت ہے۔ یہ پارٹی سنہ ۱۹۶۳ء سے تمام دوسری پارٹیوں کو ختم کر کے شام کی عنانِ اختیار سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ بھی قومیتِ عربیہ اور اشتراکیت کی علمبردار ہے۔ اس پارٹی کو ابتداءً چار قسم کے عناصر وجود میں لائے تھے۔ عیسائی عرب۔ ملحدانہ رجحانات رکھنے والے مسلمان۔ دروزی۔ اور علوی۔ اسلام کی مخالفت میں یہ چاروں متفق تھے۔ اوّل اوّل انہوں نے اُن ملحدین کو آگے رکھا جو اہلِ سنت سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً امین الحافظ اور صلاح بیطار جیسے لوگ۔ پھر دروزیوں اور علویوں نے ان کو بھی نکال باہر کیا اور یہ دونوں مل کر ملک پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد خود ان دونوں میں بھی چل گئی اور علویوں نے دروزیوں کو (جن کا لیڈر سلیم حاطوم تھا) حکومت سے بے دخل کر دیا۔ اس وقت ملک تنہا علوی فرقے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ علوی اور دروزی وہی فرقے ہیں جو اسلامی تاریخ میں نُصیریہ اور قرامطہ کے نام سے معروف ہیں۔ اب نصیریہ کو علوی کہا جانے لگا ہے اور قرامطہ کے بقایا پر دروزی کے نام کا اطلاق ہوتا ہے۔ چونکہ فوج اور نظم و نسق پر اس وقت علویوں کا قبضہ ہے اس لیے شام کی عام مسلمان آبادی ان کے ہاتھ میں بے بس ہے۔ الحاد اور اشتراکیت کو زبردستی اس پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی ہر مزاحمت کو توپ و تفنگ کی طاقت سے دبایا جاتا ہے۔

اس محدود سی اقلیت کو حکمرانی کرنے کے لیے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ کوئی بیرونی قوت اس کی پشت پناہی کرے۔ رُوس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور دستِ اعانت بڑھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ پورا ملک شام اشتراکیت کی گود میں چلا گیا۔ اس پارٹی نے سنہ ۱۹۶۵ء میں دمشق کی تاریخی مسجد جامع اموی پر گولہ باری کی۔ حمص اور حماہ کی

مسجدوں میں گھس کر نمازیوں پر فائرنگ کی۔ بکثرت مسلمان علماء اور لیڈروں اور بااثر لوگوں کو قید کیا جا چکا ہے، ان کی جائدادیں ضبط کی گئی ہیں اور بہت سے لوگوں کو ملک چھوڑ کر نکل جانا پڑا ہے۔ یہ سلسلہ موجودہ جنگ کے آغاز تک چلتا رہا ہے۔ اب جنگ کے بعد امین الحافظ اور اس کے بعض ساتھیوں کو تو چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن جو علماء اور دوسرے مسلمان جیلوں میں تھے ان کی رہائی کی کوئی خبر دنیا نے اب بھی نہیں سنی ہے۔

یہ بعث پارٹی اسلام کے بارے میں کیا احساسات اور خیالات رکھتی ہے اس کا اندازہ اس کے سرکاری ترجمان "جیش الشعب" (قومی فوج) کے ایک مضمون سے لگایا جا سکتا ہے جس کے چند فقرے یہ ہیں:

"اسلام اور مسیحیت کی قدروں نے عرب انسان کو ذلیل اور توکل پرست بنا دیا جو صرف یہ کہنا جانتا ہے کہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

عرب تہذیب کی تعمیر جدید اور عرب سماج کی تشکیلِ نو کا واحد راستہ یہ ہے کہ ایک جدت پسند انقلاب پرست اشتراکی انسان کو جنم دیا جائے جس کا پختہ ایمان ہو کہ خدا، دین، سرمایہ داری، جاگیرداری، سامراج اور وہ تمام قدریں جو آج تک سماج پر چھائی ہوئی ہیں محض حنوط شدہ پتلے ہیں جنہیں تاریخ کے عجائب گھر کی زینت بنا دینا چاہیے۔ ہمیں ایسے انسان کی ضرورت نہیں ہے جو نمازیں پڑھتا ہو، ذلیل اور عاجز بنکر رکوع میں جھکا رہتا ہو۔ اپنے لیے رحم اور مغفرت کی دعائیں کرتا ہو۔ ... ہم جس انسان کے ضرورتمند ہیں وہ اشتراکی اور انقلاب پسند انسان ہے جو انسان کو حقیقتِ مطلقہ سمجھتا ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو۔"

یہ مضمون ٹھیک اس زمانے میں شائع کیا گیا جب اسرائیل کا طوفان عرب ممالک کے سر پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تُلا کھڑا تھا۔ جس وقت یہ مضمون شائع ہوا پورے شام میں اس پر شدید احتجاج کیا گیا اور اس پر ایک ہفتہ تک ہڑتال جاری رہی، مگر معقولیت کے ساتھ کوئی بات

ماننے اور تسلیم کرنے کی جگہ احتجاج کرنے والوں کو سختی سے دبانے کی بھرپور کوشش کی گئی، بڑے بڑے علماء کو گرفتار کیا گیا۔ احتجاج اور ہڑتال کرنے والوں کو پکڑا گیا، بہت سے لوگوں کی جائدادیں ضبط کرلی گئیں، اور الزام لگایا گیا کہ یہ سب استعمار کے ایجنٹ ہیں۔

یوں اس جنگ سے ایک روز پہلے تک شام کی مسلح افواج اپنے بھائیوں کو ہی تہس نہس کرنے میں سرگرم عمل تھیں جس طرح مصر اپنی ساری طاقت اخوان کو کچلنے اور گرد و پیش کی عرب ریاستوں کو اپنے زیر اثر لانے اور یمن کو سرنگوں کرنے میں صرف کرتا رہا بالکل اسی طرح شام کی حکمراں پارٹی اپنی ساری قوت دینی عناصر کو دبانے اور اہلِ شام پر الحاد و اشتراکیت کو زبردستی مسلط کرنے میں کھپاتی رہی۔ اور روس اس اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں ملکوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتا رہا۔ اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ روس کی معاونت اور دستگیری اور اس کی براہِ راست نگرانی کے بغیر شام کی حکومت تو زندہ ہی نہیں رہ سکتی اور مصر بھی اپنے بل بوتے پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔

شام سے متصل دوسرا چھوٹا سا ملک اُردن ہے۔ اس ملک کے باشندوں میں اگرچہ جینے کا عزم اور حوصلہ موجود ہے اور وہ اپنے تحفظ کے لیے اپنی جانوں پر کھیلنا بھی جانتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے موجودہ جنگ میں ثابت کر دیا ہے۔ مگر شام اور مصر کی طرف سے اُس کے داخلی معاملات میں ایک مدت سے مسلسل مداخلت کی جاتی رہی، اس کے حکمران کو استعمار کا ایجنٹ قرار دیا جاتا رہا اور حالیہ جنگ سے چند روز پہلے تک اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ ان وجوہ سے یہ ملک سازشوں کا اڈہ بن گیا تھا اور اس کے سربراہ کی ہمت و جرأت کے باوجود اس کے وسائل کا زیادہ حصہ اس اندرونی خلفشار کی روک تھام میں صرف ہوتا رہا۔ حد یہ ہے کہ محاذ آزادیٔ فلسطین کے لیڈر احمد شقیری صاحب بھی فلسطین کو یہودیوں سے آزاد کرانے کی بہ نسبت شاہ حسین کے اقتدار کا تختہ اُلٹنے کو مقدم سمجھتے رہے (باقی ص ۵۵ پر)

تفہیم القرآن

الرحمٰن

(۲)

ان سمندروں سے موتی اور مونگے[20] نکلتے ہیں[21]۔ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟[22]

---

[20] اصل میں لفظ مرجان استعمال ہوا ہے۔ ابن عباس، قتادہ، ابن زید اور ضحاک رحمہم اللہ کا قول ہے کہ اس سے مراد چھوٹے موتی ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ عربی میں مونگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[21] اصل الفاظ ہیں یَخْرُجُ مِنْهُمَا "ان دونوں سمندروں سے نکلتے ہیں"۔ معترضین اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ موتی اور مونگے تو صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں، پھر یہ کیسے کہا گیا کہ میٹھے اور کھاری دونوں پانیوں سے یہ چیزیں نکلتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سمندروں میں میٹھا اور کھاری دونوں طرح کا پانی جمع ہو جاتا ہے، اس لیے خواہ یہ کہا جائے کہ دونوں کے مجموعہ سے یہ چیزیں نکلتی ہیں، یا یہ کہا جائے کہ وہ دونوں پانیوں سے نکلتی ہیں، بات ایک ہی رہتی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ مزید تحقیقات سے یہ ثابت ہو کہ ان چیزوں کی پیدائش سمندر میں اُس جگہ ہوتی ہے جہاں اُس کی تہ سے میٹھے پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں، اور ان کی پیدائش و پرورش میں دونوں طرح کے پانیوں کے اجتماع کا کچھ دخل ہے۔ بحرین میں جہاں قدیم ترین زمانے سے موتی نکالے جا رہے ہیں، وہاں تو یہ بات ثابت ہے کہ خلیج کی تہ میں میٹھے پانی کے چشمے موجود ہیں۔

[22] یہاں بھی اگرچہ "آلاء" میں قدرت کا پہلو نمایاں ہے، لیکن نعمت اور اوصافِ حمیدہ کا پہلو بھی مخفی نہیں ہے۔ یہ خدا کی نعمت ہے کہ سمندر سے یہ قیمتی چیزیں برآمد ہوتی ہیں، اور یہ اس کی شانِ ربوبیت

اور یہ جہاز اُسی کے ہیں [۲۳] جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں۔ پس اے جن و انس،
ع ۱ تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاؤ گے؟ [۲۴]
ہر چیز [۲۵] جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات

ہے کہ جس مخلوق کو اس نے ذوقِ جمال اور شوقِ زینت بخشا تھا اس کے ذوق و شوق کی تسکین کے لیے طرح طرح کی حسین چیزیں اس نے اپنی دنیا میں پیدا کر دیں۔

۲۳ یعنی اُسی کی قدرت سے بنے ہیں۔ اُسی نے انسان کو یہ صلاحیت بخشی کہ سمندروں کو پار کرنے کے لیے جہاز بنائے۔ اُسی نے زمین پر وہ سامان پیدا کیا جس سے جہاز بن سکتے ہیں۔ اور اُسی نے پانی کو اُن قواعد کا پابند کیا جن کی بدولت غضبناک سمندروں کے سینے پر پہاڑ جیسے جہازوں کا چلنا ممکن ہوا۔

۲۴ یہاں "آلاء" میں نعمت و احسان کا پہلو نمایاں ہے، مگر اوپر کی تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قدرت اور صفاتِ حسنہ کا پہلو بھی اس میں موجود ہے۔

۲۵ یہاں سے آیت ۳۰ تک جن و انس کو دو حقیقتوں سے آگاہ کیا گیا ہے:

ایک یہ کہ نہ تم خود لافانی ہو اور نہ وہ سروسامان لازوال ہے جس سے تم اس دنیا میں متمتع ہو رہے ہو۔ لافانی اور لازوال تو صرف اُس خدائے بزرگ و برتر کی ذات ہے جس کی عظمت پر یہ کائنات گواہی دے رہی ہے اور جس کے کرم سے تم کو یہ کچھ نعمتیں نصیب ہوئی ہیں۔ اب اگر تم میں سے کوئی شخص ہم چومن دیگرے نیست کے گھمنڈ میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ محض اس کی کم ظرفی ہے۔ اپنے ذرا سے دائرۂ اختیار میں کوئی بے وقوف کبریائی کے ڈنکے بجا لے، یا چند بندے جو اُس کے ہتھے چڑھیں، اُن کا خدا بن بیٹھے، تو یہ دھوکے کی ٹٹی کتنی دیر کھڑی رہ سکتی ہے۔ کائنات کی وسعتوں میں جس زمین کی حیثیت ایک مٹر کے دانے برابر بھی نہیں ہے، اُس کے ایک کونے میں دس بیس یا پچاس ساٹھ برس جو خدائی اور کبریائی چلے اور پھر قصۂ ماضی بن کر رہ جائے، وہ آخر کیا خدائی اور کیا کبریائی ہے جس پر کوئی پھولے۔

دوسری اہم حقیقت جس پر ان دونوں مخلوقوں کو متنبہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے سوا دوسری جن ہستیوں کو بھی تم معبود و مشکل کشا اور حاجت روا بناتے ہو، خواہ وہ فرشتے ہوں

ہی باقی رہنے والی ہے۔ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟[۲۶] زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں سب اپنی حاجتیں اُسی سے مانگ رہے ہیں۔ ہر آن وہ نئی شان میں ہے[۲۷]۔ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن صفاتِ حمیدہ کو جھٹلاؤ گے؟[۲۸]

یا انبیاء و اولیاء، یا چاند اور سورج، یا اور کسی قسم کی مخلوق، ان میں سے کوئی تمہاری کسی حاجت کو پورا نہیں کرسکتا۔ وہ بیچارے تو خود اپنی حاجات و ضروریات کے لیے اللہ کے محتاج ہیں۔ ان کے ہاتھ تو خود اس کے آگے پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ خود اپنی مشکل کشائی بھی اپنے بل بوتے پر نہیں کرسکتے تو تمہاری مشکل کشائی کیا کریں گے۔ زمین سے آسمانوں تک اس ناپیدا کنار کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، تنہا ایک خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ کارفرمائی میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہے کہ وہ کسی معاملہ میں کسی بندے کی قسمت پر اثر انداز ہو سکے۔

۲۶؎ یہاں موقع و محل خود بتا رہا ہے کہ آلاء کا لفظ کمالات کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فانی مخلوقات میں سے جو کوئی بھی کبریائی کے زعم میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنی جھوٹی خدائی کو لازوال سمجھ کر اینٹھتا اور اکڑتا ہے وہ اگر زبان سے نہیں تو اپنے عمل سے ضرور رب العالمین کی عظمت و جلالت کو جھٹلاتا ہے۔ اُس کا غرور بجائے خود اللہ کی کبریائی کی تکذیب ہے۔ جو دعویٰ بھی وہ کسی کمال کا اپنی زبان سے کرتا ہے یا جس کا ادّعا اپنے نفس میں رکھتا ہے، وہ اصل صاحبِ کمال کے مقام و منصب کا انکار ہے۔

۲۷؎ یعنی ہر وقت اس کارگاہِ عالم میں اس کی کارفرمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ کسی کو مار رہا ہے اور کسی کو جلا رہا ہے۔ کسی کو اٹھا رہا ہے اور کسی کو گرا رہا ہے۔ کسی کو شفا دے رہا ہے اور کسی کو بیماری میں مبتلا کر رہا ہے۔ کسی ڈوبتے کو بچا رہا ہے اور کسی تیرتے کو ڈبو رہا ہے۔ بے شمار مخلوقات کو طرح طرح سے رزق دے رہا ہے۔ بے حد و حساب چیزیں نئی سے نئی وضع اور شکل اور اوصاف کے ساتھ پیدا کر رہا ہے۔ اُس کی دنیا کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور اس کا خالق ہر بار اسے ایک نئی صورت سے ترتیب دیتا ہے جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔

اَے زمین کے بوجھو،[۲۹] عنقریب ہم تم سے باز پُرس کرنے کے لیے فارغ ہوئے جاتے ہیں،[۳۰] پھر دیکھ لیں گے کہ) تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاتے ہو۔[۳۱] اَے گروہ جن و انس،

۲۸؎ یہاں آلاء کا مفہوم اَوصاف ہی زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ ہر شخص جو کسی نوعیت کا شرک کرتا ہے، دراصل وہ اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کی تکذیب کرتا ہے۔ کسی کا یہ کہنا کہ فلاں حضرت نے میری بیماری دُور کر دی، اصل میں یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ شافی نہیں ہے بلکہ وہ حضرت شافی ہیں۔ کسی کا یہ کہنا کہ فلاں بزرگ کی عنایت سے مجھے روزگار مل گیا، حقیقت میں یہ کہنا ہے کہ رازق اللہ نہیں ہے بلکہ وہ بزرگ رازق ہیں۔ کسی کا یہ کہنا کہ فلاں آستانے سے میری مراد بر آئی، گویا دراصل یہ کہنا ہے کہ دنیا میں حکم اللہ کا نہیں بلکہ اُس آستانے کا چل رہا ہے۔ غرض ہر مشرکانہ عقیدہ اور مشرکانہ قول آخری تجزیہ میں صفاتِ الٰہی کی تکذیب ہی پر منتہی ہوتا ہے۔ شرک کے معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی دوسروں کو سمیع و بصیر، عالم الغیب، فاعلِ مختار، قادر و متصرف، اور الوہیت کے دوسرے اوصاف سے متصف قرار دے رہا ہے اور اس بات کا انکار کر رہا ہے کہ اکیلا اللہ ہی ان صفات کا مالک ہے۔

۲۹؎ اصل میں لفظ ثَقَلَیْن استعمال ہوا ہے جس کا مادہ ثقل ہے۔ ثِقْل کے معنی بوجھ کے ہیں، اور ثَقَل اُس بار کو کہتے ہیں جو سواری پر لدا ہوا ہو۔ ثقلین کا لفظی ترجمہ ہوگا "دو لدے ہوئے بوجھ"۔ اِس جگہ یہ لفظ جن و انس کے لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں زمین پر لدے ہوئے ہیں، اور چونکہ اُوپر سے خطاب اُن انسانوں اور جنوں سے ہوتا چلا آرہا ہے جو اپنے رب کی طاعت و بندگی سے منحرف ہیں، اور آگے بھی آیت ۴۵ تک وہی مخاطب ہیں، اس لیے اُن کو اَیُّھَا الثَّقَلٰنِ کہہ کر خطاب فرمایا گیا ہے، گویا خالق اپنی مخلوق کے ان دونوں نالائق گروہوں سے فرما رہا ہے کہ اَے وہ لوگو جو میری زمین پر بار بنے ہوئے ہو، عنقریب میں تمھاری خبر لینے کے لیے فارغ ہوا جاتا ہوں۔

۳۰؎ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اِس وقت اللہ تعالیٰ ایسا مشغول ہے کہ اسے اِن نافرمانوں سے باز پُرس کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اوقات نامہ مقرر کر رکھا ہے جس کے مطابق پہلے وہ ایک معین مدت تک اِس دنیا میں انسانوں اور

اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لیے بڑا زور چاہیے۔ ۳۱ اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے؟ (بھاگنے کی کوشش کرو گے تو)

جنوں کی نسلوں پر نسلیں پیدا کرتا رہے گا اور انہیں دنیا کی اس امتحان گاہ میں لاکر کام کرنے کا موقع دیگا۔ پھر ایک مخصوص ساعت میں امتحان کا یہ سلسلہ یک لخت بند کر دیا جائے گا اور تمام جن وانس جو اُس وقت موجود ہونگے بیک وقت ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ پھر ایک اور ساعت نوعِ انسانی اور نوعِ جن، دونوں سے بازپرس کرنے کے لیے اس کے ہاں طے شدہ ہے جب اُن کے اوّلین و آخرین کو از سرِ نو زندہ کر کے بیک وقت جمع کیا جائے گا۔ اِس اوقات نامہ کے لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ ابھی ہم پہلے دَور کا کام کر رہے ہیں اور دوسرے دَور کا وقت ابھی نہیں آیا ہے، کجا کہ تیسرے دَور کا کام اِس وقت شروع کر دیا جائے، مگر تم گھبراؤ نہیں، عنقریب وہ وقت آیا چاہتا ہے جب ہم تمہاری خبر لینے کے لیے فارغ ہو جائیں گے۔ یہ عدم فراغت اس معنی میں نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک کام نے ایسا مشغول کر رکھا ہے کہ دوسرے کام کی فرصت وہ نہیں پا رہا ہے۔ بلکہ اس کی نوعیت ایسی ہے جیسے ایک شخص نے مختلف کاموں کے لیے ایک ٹائم ٹیبل بنا رکھا ہو اور اُس کی رُو سے جس کام کا وقت ابھی نہیں آیا ہے اُس کے بارے میں وہ کہے کہ میں سرِدست اُس کے لیے فارغ نہیں ہوں۔

۳۱ یہاں آلاء کو قدرتوں کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ سلسلۂ کلام کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ دونوں معنی ایک ایک لحاظ سے مناسب نظر آتے ہیں۔ ایک معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ آج تم ہماری نعمتوں کی ناشکریاں کر رہے ہو اور کفر، شرک، دہریت، فسق اور نافرمانی کے مختلف رویّے اختیار کر کے طرح طرح کی نمک حرامیاں کیے چلے جاتے ہو، مگر کل جب بازپرس کا وقت آئے گا اس وقت ہم دیکھیں گے کہ ہماری کس کس نعمت کو تم اتفاقی حادثہ، یا اپنی قابلیت کا ثمرہ، یا کسی دیوی دیوتا یا بزرگ ہستی کی مہربانی کا کرشمہ ثابت کرتے ہو۔ دوسرے معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ آج تم قیامت، اور حشر و نشر، اور حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کا مذاق اڑاتے ہو اور اپنے نزدیک اس خیالِ خام میں مبتلا ہو کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ مگر جب ہم بازپرس کے لیے تم کو گھیر لائیں گے اور وہ سب کچھ تمہارے سامنے

تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں[۴۳] چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے۔ اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کا انکار کرو گے؟

پھر کیا بنے گی اُس وقت) جب آسمان پھٹے گا اور لال چمڑے کی طرح سُرخ ہو جائے گا؟[۴۴]

اے جن و انس (اُس وقت) تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟[۴۵]

آجائے گا جس کا آج تم انکار کر رہے ہو اُس وقت ہم دیکھیں گے کہ ہماری کس کس قدرت کو تم جھٹلاتے ہو۔

۴۲ زمین اور آسمانوں سے مراد ہے کائنات، یا بالفاظ دیگر خدا کی خدائی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی گرفت سے بچ نکلنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ جس بازپُرس کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے اُس کا وقت آنے پر تم خواہ کسی جگہ بھی ہو، بہرحال پکڑ لائے جاؤ گے۔ اُس سے بچنے کے لیے تمہیں خدا کی خدائی سے بھاگ نکلنا ہوگا اور اِس کا بل بوتا تم میں نہیں ہے۔ اگر ایسا گھمنڈ تم اپنے دل میں رکھتے ہو تو اپنا زور لگا کر دیکھ لو۔

۴۳ اصل میں شُواظ اور نُحاس کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ شُواظ اُس خالص شُعلے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دھواں نہ ہو۔ اور نُحاس اُس خالص دھوئیں کو کہتے ہیں جس میں شُعلہ نہ ہو۔ یہ دونوں چیزیں یکے بعد دیگرے انسانوں اور جنوں پر اُس حالت میں چھوڑی جائیں گی جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بازپُرس سے بچ کر بھاگنے کی کوشش کریں۔

۴۴ یہ روزِ قیامت کا ذکر ہے۔ آسمان کے پھٹنے سے مُراد ہے بندشِ افلاک کا کھُل جانا، اجرامِ سماوی کا منتشر ہو جانا، عالمِ بالا کے نظم کا درہم برہم ہو جانا۔ اور یہ جو فرمایا کہ آسمان اُس وقت لال چمڑے کی طرح سُرخ ہو جائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس ہنگامۂ عظیم کے وقت جو شخص زمین سے آسمان کی طرف دیکھے گا اُسے یوں محسوس ہوگا کہ جیسے سارے عالمِ بالا پر ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔

۴۵ یعنی آج تم قیامت کو ناممکن قرار دیتے ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ اس کے برپا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ مگر جب وہ برپا ہو جائے گی اور اپنی آنکھوں سے تم وہ سب کچھ دیکھ لو گے جس کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے، اُس وقت تم اللہ کی کس کس قدرت کا انکار کرو گے؟

اُس روز کسی انسان اور کسی جن سے اُس کا گناہ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی[۳۶]، پھر دیکھ لیا جائیگا
کہ تم دونوں گروہ اپنے رب کے کن کن احسانات کا انکار کرتے ہو[۳۷]۔ مجرم وہاں اپنے چہروں

---

[۳۶] اس کی تشریح آگے کا یہ فقرہ کر رہا ہے کہ "مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لیے جائیں گے"۔ مطلب یہ ہے کہ اُس عظیم الشان مجمع میں جہاں تمام اوّلین و آخرین اکٹھے ہونگے، یہ پوچھتے پھرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ کون کون لوگ مجرم ہیں۔ نہ کسی انسان یا جن سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئے گی کہ وہ مجرم ہے یا نہیں۔ مجرموں کے اُترے ہوئے چہرے اور اُن کی خوف زدہ آنکھیں اور اُن کی گھبراتی ہوئی صورتیں اور اُن کے چھوٹتے ہوئے پسینے خود ہی یہ راز فاش کر دینے کے لیے کافی ہونگے کہ وہ مجرم ہیں۔ پولیس کے گھیرے میں اگر ایک ایسا مجمع آجائے جس میں بے گناہ اور مجرم، دونوں قسم کے لوگ ہوں، تو بے گناہوں کے چہرے کا اطمینان اور مجرموں کے چہروں کا اضطراب یک نظر بتا دیتا ہے کہ اس مجمع میں مجرم کون ہے اور بے گناہ کون۔ دنیا میں یہ کلیہ بسا اوقات اس لیے غلط ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی پولیس کے بے لاگ انصاف پسند ہونے پر لوگوں کو بھروسا نہیں ہوتا، بلکہ بارہا اس کے ہاتھوں مجرموں کی بہ نسبت شریف لوگ زیادہ پریشان ہوتے ہیں، اس لیے یہاں یہ ممکن ہے کہ اِس پولیس کے گھیرے میں آکر شریف لوگ مجرموں سے بھی زیادہ خوف زدہ ہو جائیں۔ مگر آخرت میں، جہاں ہر شریف آدمی کو اللہ تعالیٰ کے انصاف پر کامل اعتماد ہوگا، یہ گھبراہٹ صرف انہی لوگوں پر طاری ہوگی جن کے ضمیر خود اپنے مجرم ہونے سے آگاہ ہونگے اور جنہیں میدانِ حشر میں پہنچتے ہی یقین ہو جائیگا کہ اب ان کی وہ شامت آگئی ہے جسے ناممکن یا مشتبہ سمجھ کر وہ دنیا میں جرائم کرتے رہے تھے۔

[۳۷] جرم کی حقیقی بنیاد قرآن کی نگاہ میں یہ ہے کہ بندہ جو اپنے رب کی نعمتوں سے متمتع ہو رہا ہے، اپنے نزدیک یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ نعمتیں کسی کی دی ہوئی نہیں ہیں بلکہ آپ سے آپ اسے مل گئی ہیں، یا یہ کہ یہ نعمتیں خدا کا عطیہ نہیں بلکہ اس کی اپنی قابلیت یا خوش نصیبی کا ثمرہ ہیں، یا یہ کہ یہ ہیں تو خدا کا عطیہ مگر اُس خدا کا اپنے بندے پر کوئی حق نہیں ہے، یا یہ کہ خدا نے خود یہ مہربانیاں اُس پر نہیں کی ہیں بلکہ یہ کسی دوسری ہستی نے اُس سے کروا دی ہیں۔ یہی وہ غلط تصورات ہیں جن کی بنا پر آدمی

سے پہچان لیے جائیں گے اور انہیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔ اُس وقت تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے ؟ (اُس وقت کہا جائے گا) یہ وہی جہنم ہے جس کو مجرمین جھوٹ قرار دیا کرتے تھے۔ اُسی جہنم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان وہ گردش کرتے رہیں گے۔ پھر اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے ؟[۳۹] ع۲

خدا سے بے نیاز اور اس کی اطاعت و بندگی سے آزاد ہو کر دنیا میں وہ افعال کرتا ہے جن سے خدا نے منع کیا ہے اور وہ افعال نہیں کرتا جن کا اس نے حکم دیا ہے۔ اس لحاظ سے ہر جرم اور ہر گناہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے احسانات کی تکذیب ہے قطع نظر اس سے کہ کوئی شخص زبان سے ان کا انکار کرتا ہو یا اقرار۔ مگر جو شخص فی الواقع تکذیب کا ارادہ نہیں رکھتا، بلکہ اس کے ذہن کی گہرائیوں میں تصدیق موجود ہوتی ہے، وہ احیاناً کسی بشری کمزوری سے کوئی قصور کر بیٹھے تو اس پر استغفار کرتا ہے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیز اُسے مکذبین میں شامل ہونے سے بچا لیتی ہے۔ اس کے سوا باقی تمام مجرم درحقیقت اللہ کی نعمتوں کے مکذب اور اس کے احسانات کے منکر ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ جب تم لوگ مجرم کی حیثیت سے گرفتار ہو جاؤ گے اُس وقت ہم دیکھیں گے کہ تم ہمارے کس کس احسان کا انکار کرتے ہو۔ سورۂ تکاثر میں یہی بات اِس طرح فرمائی گئی ہے کہ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ، اُس روز ضرور تم سے اُن نعمتوں کے بارے میں باز پُرس کی جائے گی جو تمہیں دی گئی تھیں۔ یعنی پوچھا جائے گا کہ یہ نعمتیں ہم نے تمہیں دی تھیں یا نہیں ؟ اور انہیں پا کر تم نے اپنے محسن کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کیا اور اس کی نعمتوں کو کس طرح استعمال کیا؟

۳۸؎ یعنی جہنم میں بار بار پیاس کے مارے ان کا بُرا حال ہو گا، بھاگ بھاگ کر پانی کے چشموں کی طرف جائیں گے، مگر وہاں کھولتا ہوا پانی ملے گا جس کے پینے سے کوئی پیاس نہ بجھے گی۔ اِس طرح جہنم اور ان چشموں کے درمیان گردش کرتے ہی میں اُن کی عمریں بیت جائیں گی۔

۳۹؎ یعنی کیا اُس وقت بھی تم اِس کا انکار کر سکو گے کہ خدا قیامت لا سکتا ہے، تمہیں موت کے بعد دوسری زندگی دے سکتا ہے، تم سے باز پُرس بھی کر سکتا ہے، اور یہ جہنم بھی بنا سکتا ہے جس میں آج تم سزا پا رہے ہو ؟

اور ہر اُس شخص کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہو،[۴۰] دو باغ ہیں۔[۴۱] اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟[۴۲] ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور۔ اپنے رب کے کن کن انعامات

---

۴۰ یعنی جس نے دنیا میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کی ہو، جسے ہمیشہ یہ احساس رہا ہو کہ میں دنیا میں غیر ذمہ دار شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہوں، بلکہ ایک روز مجھے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ یہ عقیدہ جس شخص کا ہو وہ لامحالہ خواہشاتِ نفس کی بندگی سے بچے گا۔ اندھا دھند ہر راستے پر نہ چل کھڑا ہوگا۔ حق و باطل، ظلم و انصاف، پاک و ناپاک اور حلال و حرام میں تمیز کرے گا۔ اور جان بوجھ کر خدا کے احکام کی پیروی سے منہ نہ موڑے گا۔ یہی اُس جزا کی اصل علت ہے جو آگے بیان کی جارہی ہے۔

۴۱ جنت کے اصل معنی باغ کے ہیں۔ قرآن مجید میں کہیں تو اُس پورے عالم کو جس میں نیک لوگ رکھے جائیں گے جنت کہا گیا ہے، گویا کہ وہ پورا کا پورا ایک باغ ہے۔ اور کہیں فرمایا گیا ہے کہ ان کے لیے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس بڑے باغ میں بے شمار باغات ہونگے۔ اور یہاں تعین کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ ہر نیک شخص کو اُس بڑی جنت میں دو دو جنتیں دی جائیں گی جو اسی کے لیے مخصوص ہونگی، جن میں اس کے اپنے قصر ہونگے، جن میں وہ اپنے متعلقین اور خدام کے ساتھ شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ رہے گا، جن میں اس کے لیے وہ کچھ سروسامان فراہم ہوگا جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۴۲ یہاں سے آخر تک آلاء کا لفظ نعمتوں کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور قدرتوں کے معنی میں بھی۔ اور ایک پہلو اس میں صفاتِ حمیدہ کا بھی ہے۔ اگر پہلے معنی لیے جائیں تو اس سلسلہ بیان میں اِس فقرے کو بار بار دہرانے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم جھٹلانا چاہتے ہو تو جھٹلاتے رہو، خدا ترس لوگوں کو تو ان کے رب کی طرف سے یہ نعمتیں ضرور مل کر رہیں گی۔ دوسرے معنی لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے نزدیک اللہ کا جنت بنانے پر قادر ہونا اور اس میں یہ نعمتیں اپنے نیک بندوں کو عطا کرنا غیر ممکن ہے تو ہوتا رہے، اللہ یقیناً اس کی قدرت رکھتا ہے اور وہ یہ کام کر کے رہے گا۔ تیسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تم نیکی اور بدی کی تمیز سے عاری سمجھتے ہو۔ تمہارے نزدیک وہ اتنی بڑی دنیا تو بنا بیٹھا ہے

کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں دو چشمے رواں۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں۔[۴۳] اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ جنتی لوگ ایسے فرشوں پر تکیے لگا کے بیٹھیں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہونگے،[۴۴] اور باغوں کی ڈالیاں پھلوں سے جھکی پڑ رہی ہونگی۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ اِن نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہونگی[۴۵] جنہیں ان جنتیوں سے پہلے کبھی کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہوگا۔[۴۶] اپنے

مگر اس میں خواہ کوئی ظلم کرے یا انصاف، حق کے لیے کام کرے یا باطل کے لیے، شر پھیلائے یا خیر، اُسے اس کی کوئی پروا نہیں۔ وہ نہ ظالم کو سزا دینے والا ہے، نہ مظلوم کی دادرسی کرنے والا۔ نہ خیر کا قدر شناس ہے نہ شر سے نفور۔ پھر وہ تمہارے خیال میں عاجز بھی ہے۔ زمین و آسمان تو وہ بنا لیتا ہے، مگر ظالموں کی سزا کے لیے جہنم اور حق کی پیروی کرنے والوں کو اجر دینے کے لیے جنت بنا دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ اُس کے اوصافِ حمیدہ کی یہ تکذیب آج تم جتنی چاہو کر لو۔ کل جب وہ ظالموں کو جہنم میں جھونک دیگا اور حق پرستوں کو جنت میں یہ کچھ نعمتیں دیگا، کیا اُس وقت بھی تم اس کے اِن اوصاف کو جھٹلا سکو گے؟

۴۳ـــ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں باغوں کے پھلوں کی شان نرالی ہوگی۔ ایک باغ میں جائے گا تو ایک شان کے پھل اس کی ڈالیوں میں لدے ہوئے ہونگے۔ دوسرے باغ میں جائے گا تو اس کے پھلوں کی شان کچھ اور ہی ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہر باغ میں ایک قسم کے پھل معروف ہونگے جن سے وہ دنیا میں بھی آشنا تھا، خواہ مزے میں وہ دنیا کے پھلوں سے کتنے ہی فائق ہوں، اور دوسری قسم کے پھل نادر ہونگے جو دنیا میں کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے۔

۴۴ـــ یعنی جب ان کے استر اس شان کے ہونگے تو اندازہ کر لو کہ ابرے کس شان کے ہونگے۔

۴۵ـــ یہ عورت کی اصل خوبی ہے کہ وہ بے شرم اور بیباک نہ ہو بلکہ نظر میں حیا رکھتی ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کے درمیان عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے ان کے حسن و جمال کی نہیں بلکہ ان کی حیاداری اور عفت مآبی کی تعریف فرمائی ہے۔ حسین عورتیں تو مخلوط کلبوں اور فلمی نگارخانوں میں بھی جمع ہو جاتی ہیں، اور حسن کے مقابلوں میں تو چھانٹ چھانٹ کر ایک سے ایک حسین عورت لائی جاتی ہے، مگر صرف ایک بدذوق اور بدقوارہ آدمی ہی ان سے دلچسپی لے سکتا ہے۔ کسی شریف آدمی کو وہ حسن اپیل نہیں کر سکتا جو ہر بد نظر کو دعوتِ نظارہ دے اور ہر آغوش کی زینت بننے کے لیے تیار ہو۔

رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟ ایسی خوبصورت جیسے ہیرے اور موتی۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟

نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔[۶۳] پھر اے جن وانس، اپنے رب کے کن کن اوصاف حمیدہ کا تم انکار کرو گے ؟[۶۴]

---

[۶۲] اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں خواہ کوئی عورت کنواری مرگئی ہو یا کسی کی بیوی رہ چکی ہو، جوان مری ہو یا بوڑھی ہو کر دنیا سے رخصت ہوئی ہو، آخرت میں جب یہ سب نیک خواتین جنت میں داخل ہونگی تو جوان اور کنواری بنادی جائیں گی، اور وہاں ان میں سے جس خاتون کو بھی کسی نیک مرد کی رفیقۂ حیات بنایا جائے گا وہ جنت میں اپنے اُس شوہر سے پہلے کسی کے تصرف میں آئی ہوئی نہ ہوگی۔

اس آیت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جنت میں نیک انسانوں کی طرح نیک جن بھی داخل ہونگے اور وہاں جس طرح انسان مردوں کے لیے انسان عورتیں ہونگی اسی طرح جن مردوں کے لیے جن عورتیں بھی ہونگی۔ دونوں کی رفاقت کے لیے انہی کے ہم جنس جوڑے ہونگے۔ ایسا نہ ہوگا کہ ان کا جوڑ کسی ناجنس مخلوق سے لگا دیا جائے جس سے وہ فطرتاً مانوس نہیں ہو سکتے۔ آیت کے یہ الفاظ کہ "ان سے پہلے کسی انسان یا جن نے ان کو نہ چھوا ہوگا" اس معنی میں نہیں ہیں کہ وہاں عورتیں صرف انسان ہونگی اور اُن کو اُن کے شوہروں سے پہلے کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہوگا، بلکہ ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہاں جن اور انسان دونوں جنسوں کی عورتیں ہونگی، سب حیادار اور اچھوتی ہونگی، نہ کسی جن عورت کو اس کے جنتی شوہر سے پہلے کسی جن مرد نے ہاتھ لگایا ہوگا اور نہ کسی انسان عورت کو اس کے جنتی شوہر سے پہلے کسی انسان مرد نے ملوث کیا ہوگا۔

[۶۳] یعنی آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر دنیا میں عمر بھر اپنے نفس پر پابندیاں لگائے رہے ہوں، حرام سے بچتے اور حلال پر اکتفا کرتے رہے ہوں، فرض کو فرض جان کر اپنے فرائض بجا لاتے رہے ہوں، حق کو حق مان کر تمام حق داروں کے حقوق ادا کرتے رہے ہوں، اور شر کے مقابلے میں ہر طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کر کے خیر کی حمایت کرتے رہے ہوں، اللہ اُن کی یہ ساری قربانیاں ضائع

اور اُن دو باغوں کے علاوہ دو باغ اور ہونگے[۴۹] - اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟

کر دے اور انہیں کبھی اِن کا اجر نہ دے ؟

[۴۸] ظاہر بات ہے کہ جو شخص جنّت اور اس کے اجر و ثواب کا منکر ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفاتِ حسنہ کا انکار کرتا ہے - وہ اگر خدا کو مانتا بھی ہے تو اس کے متعلق بہت بُری رائے رکھتا ہے - اس کے نزدیک وہ ایک چوپٹ راجہ ہے جس کی اندھیر نگری میں نیکی کرنا گویا اُسے دریا میں ڈال دینا ہے - وہ یا تو اسے اندھا اور بہرا سمجھتا ہے جسے کچھ خبر ہی نہیں کہ اس کی خدائی میں کون اس کی رضا کی خاطر جان، مال، نفس اور محنتوں کی قربانیاں دے رہا ہے - یا اس کے نزدیک وہ بے حس اور ناقدر شناس ہے جسے بھلے اور بُرے کی کچھ تمیز نہیں - یا پھر اس کے خیالِ ناقص میں وہ عاجز و درماندہ ہے جس کی نگاہ میں نیکی کی قدر چاہے کتنی ہی ہو، مگر اس کا اجر دینا اُس کے بس ہی میں نہیں ہے - اسی لیے فرمایا کہ جب آخرت میں نیکی کا نیک بدلہ تمہاری آنکھوں کے سامنے دے دیا جائے گا، کیا اُس وقت بھی تم اپنے رب کے اوصافِ حمیدہ کا انکار کر سکو گے ؟

[۴۹] اصل الفاظ ہیں مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ - دُوْن کا لفظ عربی زبان میں تین مختلف معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے - ایک، کسی اونچی چیز کے مقابلے میں نیچے ہونا - دوسرے، کسی افضل و اشرف چیز کے مقابلے میں کم تر ہونا - تیسرے، کسی چیز کے ماسوا یا اس کے علاوہ ہونا - اِس اختلافِ معنی کی بنا پر اِن الفاظ میں ایک احتمال یہ ہے کہ ہر جنتی کو پہلے کے دو باغوں کے علاوہ یہ دو باغ اور دیئے جائیں گے - دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ دو باغ اوپر کے دونوں باغوں کی بہ نسبت مقام یا مرتبے میں فروتر ہونگے، یعنی پہلے دو باغ یا تو بلندی پر ہونگے اور یہ ان سے نیچے واقع ہونگے، یا پہلے دو باغ بہت اعلیٰ درجہ کے ہونگے اور یہ ان کے مقابلے میں کم تر درجہ کے ہونگے - اگر پہلے احتمال کو اختیار کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دو مزید باغ بھی انہی جنتیوں کے لیے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے - اور دوسرے احتمال کو اختیار کرنے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ پہلے دو باغ مقربین کے لیے ہیں - اور یہ دو باغ اصحاب الیمین کے لیے - اِس دوسرے احتمال کو جو چیز تقویت پہنچاتی ہے

گھنے سر سبز و شاداب باغ ۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟ دونوں باغوں میں دو چشمے فواروں کی طرح اُبلتے ہوئے ۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟ ان نعمتوں کے درمیان خوب سیرت اور خوبصورت بیویاں ۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟ خیموں میں ٹھیرائی ہوئی حوریں[۵۱] ۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟ ان جنتیوں سے پہلے

دہ یہ ہے کہ سورۂ واقعہ میں نیک انسانوں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ۔ ایک سابقین ، جن کو مقربین بھی کہا گیا ہے ، دوسرے اصحاب الیمین ، جن کو اصحاب المیمنہ کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے ۔ اور ان دونوں کے لیے دو جنتوں کے اوصاف الگ الگ ارشاد فرمائے گئے ہیں ۔ مزید براں اس احتمال کو وہ حدیث بھی تقویت پہنچاتی ہے جو حضرت ابو موسیٰ اشعری سے اُن کے صاحبزادے ابوبکر نے روایت کی ہے ۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ، دو جنتیں سابقین ، یا مقربین کے لیے ہوں گی جن کے برتن اور آرائش کی ہر چیز سونے کی ہو گی ، اور دو جنتیں تابعین ، یا اصحاب الیمین کے لیے ہوں گی جن کی ہر چیز چاندی کی ہو گی (فتح الباری ، کتاب التفسیر ، تفسیر سورۂ رحمٰن) ۔

[۵۰] ان باغوں کی تعریف میں لفظ مُدْهَامَّتَان استعمال فرمایا گیا ہے ۔ مُدْهَامَّہ ایسی گھنی سر سبزی کو کہتے ہیں جو انتہائی شادابی کے باعث سیاہی مائل ہو گئی ہو ۔

[۵۱] حور کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ، تفسیر سورۂ صافات ، حاشیہ ۲۸ - ۲۹ - و تفسیر سورۂ دخان حاشیہ ۴۲ ۔ خیموں سے مراد غالباً اُس طرح کے خیمے ہیں جیسے امراء و رؤساء کے لیے سیرگاہوں میں لگائے جاتے ہیں ۔ اغلب یہ ہے کہ اہلِ جنت کی بیویاں ان کے ساتھ اُن کے قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں اُن کے لیے لُطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی ۔ ہمارے اس قیاس کی بنا یہ ہے کہ پہلے خوب سیرت اور خوبصورت بیویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے ۔ اس کے بعد اب حوروں کا ذکر الگ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ اُن بیویوں سے مختلف قسم کی خواتین ہوں گی ۔ اس قیاس کو مزید تقویت اُس حدیث سے حاصل ہوتی ہے جو حضرت ام سلمہ سے مروی ہے ۔ وہ فرماتی ہیں کہ " میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ، یا رسول اللہ ، دنیا کی عورتیں

کبھی کسی انسان یا جن نے اُن کو نہ چھوُا ہو گا۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟
وہ جنّتی سبز قالینوں اور نفیس و نادر فرشوں[۵۲] پر تکیے لگا کے بیٹھیں گے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟

بہتر ہیں یا حوریں؟ حضورؐ نے جواب دیا، دنیا کی عورتوں کو حوروں پر وہی فضیلت حاصل ہے جو ابرے کو استر پر ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا کس بنا پر؟ فرمایا اس لیے کہ ان عورتوں نے نمازیں پڑھی ہیں، روزے رکھے ہیں اور عبادتیں کی ہیں" (طبرانی)۔ اِس سے معلوم ہوُا کہ اہلِ جنت کی بیویاں تو وہ خواتین ہونگی جو دنیا میں ایمان لائیں، اور اعمالِ صالحہ کرتی ہوئی دنیا سے رخصت ہوئیں۔ یہ اپنے ایمان و حسنِ عمل کے نتیجے میں داخلِ جنت ہونگی اور بذاتِ خود جنت کی نعمتوں کی مستحق ہونگی۔ یہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق یا تو اپنے سابق شوہروں کی بیویاں بنیں گی اگر وہ بھی جنتی ہوں، یا پھر اللہ تعالیٰ کسی دوسرے جنتی سے ان کو بیاہ دیگا جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کی رفاقت پسند کریں۔ رہیں حوریں تو وہ اپنے کسی حسنِ عمل کے نتیجے میں خود اپنے استحقاق کی بنا پر جنتی نہیں بنیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ جنت کی دوسری نعمتوں کی طرح انہیں بھی اہلِ جنت کے لیے ایک نعمت کے طور پر جوان اور حسین و جمیل عورتوں کی شکل دے کے جنتیوں کو عطا کر دے گا تاکہ وہ ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوں۔ لیکن بہرحال یہ جن و پری کی قسم کی مخلوق نہ ہونگی، کیونکہ انسان کبھی صحبتِ ناجنس سے مانوس نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اغلب یہ ہے کہ یہ وہ معصوم لڑکیاں ہونگی جو نابالغی کی حالت میں فوت ہو گئیں اور اُن کے والدین جنت کے مستحق نہ ہوئے کہ وہ ان کی ذرّیت کی حیثیت سے جنت میں اُن کے ساتھ رکھی جائیں۔

۵۲ اصل میں لفظ عَبْقَرِی استعمال ہوُا ہے۔ عرب جاہلیت کے افسانوں میں جنوں کے دارالسلطنت کا نام عَبْقَر تھا جسے ہم اُردو میں پرستان کہتے ہیں۔ اسی کی نسبت سے عرب کے لوگ ہر نفیس و نادر چیز کو عبقری کہتے تھے، گویا وہ پرستان کی چیز ہے جس کا مقابلہ اِس دنیا کی عام چیزیں نہیں کر سکتیں۔ حتیٰ کہ ان کے محاورے میں ایسے آدمی کو بھی عبقری کہا جاتا تھا جو غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ہو، جس سے عجیب و غریب کارنامے صادر ہوں۔ انگریزی میں لفظ: (GENIUS)

بڑی برکت والا ہے تیرے ربِّ جلیل و کریم کا نام ؏

بھی اسی معنی میں بولا جاتا ہے، اور وہ بھی GENII سے ماخوذ ہے جو جِن کا ہم معنی ہے۔ اسی لیے یہاں اہل عرب کو جنت کے سر و سامان کی غیر معمولی نفاست و خوبی کا تصور دلانے کے لیے عبقری کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

شرق اوسط کا المیہ

ابوالاعلیٰ مودودی

اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان چار دن کی جنگ کے جو ہولناک نتائج سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف عربوں کی، بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں، بشرطیکہ ہمارے پاس عبرت پذیر دل، اور تجربات سے سبق سیکھنے والے دماغ موجود ہوں۔ اس جنگ میں اگر دوسری عرب ریاستوں کو شمار نہ کیا جائے جن کی مدد بروقت نہ پہنچ سکی تھی، تب بھی کم از کم چھ ریاستیں تو اپنی پوری طاقت کے ساتھ براہِ راست شریک تھیں۔ لیکن چار دن میں اسرائیل نے ان سب کو شکست دے دی۔ مصر سے غزّہ اور جزیرہ نمائے سینا کا پورا علاقہ چھین لیا۔ اردن سے فلسطین کا وہ علاقہ بھی جو ۱۹۴۹ء میں بچا رہ گیا تھا قدیم بیت المقدس سمیت لے لیا۔ اور شام کو، جو صرف دس میل اسرائیلی علاقہ میں آگے بڑھ سکا تھا، اپنی سرحدوں سے پرے دھکیل دیا، یہاں تک کہ اسرائیل کے مقبوضات کا ایک انچ رقبہ بھی عربوں کے پاس نہ رہ سکا۔ اب اسرائیل کہتا ہے کہ شرقِ اوسط کا نقشہ نئے سرے سے بننا چاہیے اور جو علاقے اس نے فتح کیے ہیں وہ بیت المقدس سمیت اس کے قبضے میں رہنے چاہییں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ اگر ہم آنکھیں بند کر کے تباہی کے گڑھے میں نہیں گرنا چاہتے تو ہمیں بے لاگ طریقے سے اس سارے معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اسرائیل کا وجود بجائے خود ایک مستقل جارحیت ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں صہیونی تحریک (ZIONIST MOVEMENT) شروع ہی اس جارحانہ مقصد کے ساتھ ہوئی تھی کہ دو ہزار برس پہلے یہودیوں کو جس سرزمین سے رومیوں نے نکالا تھا اسے وہ ہر ممکن تدبیر سے دوبارہ حاصل کریں۔ اس کا پہلا ہدف اگرچہ فلسطین تھا، مگر ان لوگوں کا آخری مقصد، جس کو انہوں نے

کبھی چھپا کر نہیں رکھا، یہ تھا کہ دریائے نیل سے لے کر فرات تک، اور شمالی حجاز سے لے کر جس میں مدینۂ طیبہ بھی شامل ہے، شام کی انتہائی شمالی سرحدوں تک، پورا علاقہ مسلمانوں سے چھین لیا جائے اور اس علاقے میں دنیا بھر کے بکھرے ہوئے یہودیوں کو لا کر بسایا جائے۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے جس حصے پر اسرائیل کی ریاست قائم ہوئی، صیہونی تحریک کے علمبرداروں کی نگاہ میں وہ دراصل محض قدم رکھنے کی جگہ تھی۔ ان کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ بس اسی علاقے کو وطنِ یہود بنانے پر اکتفا کریں گے۔ اوّل روز سے ان کے پیشِ نظر یہ تھا اور آج بھی وہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر کام کر رہے ہیں کہ ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر پھیلتے چلے جائیں یہاں تک کہ مصر سے ڈیلٹا کا علاقہ، سعودی عرب سے مدینۂ طیبہ تک کا علاقہ، پورا اردن، پورا شام، پورا لبنان، ٹرکی سے اسکندرون کا علاقہ، اور عراق سے اس کے ملک کا بڑا حصہ چھین لیں۔ ان علاقوں کو وہ صرف اپنا مقبوضہ بنا کر مسلمانوں کو وہاں غلام کی حیثیت سے نہیں رکھنا چاہتے، بلکہ وہ ان کو فنا کر کے، یا ملک سے نکال باہر کر کے زمین خالی کرانا چاہتے ہیں، تاکہ یہودیوں کو لا کر اس جگہ بسایا جائے۔ اس مقصد میں پہلی کامیابی ان کو ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی جب فلسطین کے بڑے حصے پر ان کی ریاست قائم ہوئی۔ اس کے ۱۸ سال بعد اب انہیں یہ دوسری کامیابی حاصل ہوئی ہے جس میں باقی ماندہ فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا انہوں نے چھین لیا ہے۔ لیکن یہ صرف دوسرا قدم ہی ہے۔ عربوں اور مسلمانوں کی کمزوریوں کا جو نتیجہ اس چار دن کی جنگ میں سامنے آیا ہے، اس کے بعد یہ سمجھنے کے لیے کچھ بہت زیادہ دُور اندیشی کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ وہ مزید قدم اٹھانے میں کوئی تاخیر نہ کریں گے۔

اِس صیہونی تحریک کے معاملہ میں مغربی دنیا نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کے تین بڑے محرکات ہیں جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

اوّل یہ کہ اس میں صلیبی جنگ کی روح (CRUSADE SPIRIT) کارفرما ہے۔ اسی وجہ سے سویڈن اور ڈنمارک سے لیکر کینیڈا تک پوری مغربی دنیا کھلم کھلا اسرائیل کی حمایت کر رہی ہے، اور اس مسئلے میں اُن کے درمیان وہی اتحاد پایا جاتا ہے جو قرونِ وسطیٰ کی صلیبی لڑائیوں میں پایا جاتا تھا۔

دوم یہ کہ اس معاملہ میں مغربی قوموں کی انتہائی شرمناک بداخلاقی، خود غرضی اور سنگدلی کام کرتی رہی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کے خلاف یہودیوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے انگریزوں نے فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کا اعلان کیا۔ یہ گویا اُن کی خدمات کا معاوضہ دوسروں کی جیب سے ادا کروانا تھا۔ پھر دوسری جنگِ عظیم کے بعد جو یہودی ہٹلر کے قتلِ عام سے بچ کر مختلف ملکوں میں پناہ گزیں ہوئے اُن کو آباد کرنے کا یہ طریقہ نکالا گیا کہ صدیوں سے جو عرب فلسطین میں آباد تھے ان کو اکھاڑ کر اِن یہودیوں کو ان کی جگہ بسایا جائے۔ گویا ایک ظالم کے ظلم کی تلافی دوسرے بے گناہوں پر ظلم ڈھا کر کی گئی۔ اُن کے لیے آسٹریلیا، کینیڈا، امریکہ، ارجنٹائن، برازیل اور دوسرے بڑے بڑے ملکوں کے لاکھوں مربع میل خالی پڑے ہوئے رقبوں میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ان بے گھروں کو جگہ دلوانے کی بس یہی ایک صورت تھی کہ آٹھ دس لاکھ عربوں کو مار مار کر ان کے گھروں سے نکالا جائے۔

سوم یہ کہ امریکہ پر خصوصیت کے ساتھ یہودی کچھ اس طرح چھا گیا ہے جیسے کسی آدمی پر جن سوار ہو جائے۔ امریکی پریس، خبر رساں ایجنسیوں اور مالیات پر یہ قوم پوری طرح مسلط ہے۔ اور یہودی ووٹوں کی طاقت اتنی زبردست ہے کہ امریکہ کے صدر سے لے کر کانگریس کے ممبروں تک، سب اپنی سیاسی کامیابی کے لیے ان کے محتاج ہیں۔ اِن حالات میں اگر امریکہ کو یہودیوں کی خاطر تمام دنیا کے عربوں اور مسلمانوں کو قربان بھی کر دینا پڑے تو وہ اس کی کوئی پروا نہ کریگا۔

یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر اسرائیل کے روزِ پیدائش سے مغربی دنیا نے بالعموم اور امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے بالخصوص اُس کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف تمام دنیا کے یہودیوں نے اس ریاست پر روپے کی بارش کی، یہاں تک کہ ایک اندازے کے مطابق اب تک اسے دس ارب روپیہ چندہ مل چکا ہے۔ دوسری طرف مغربی جرمنی سے اس کو چار ارب سے زیادہ رقم بطور تاوان دلوائی گئی۔ تیسری طرف امریکہ نے اسے تقریباً آٹھ ارب روپے کی مالی امداد دی اور اس پر مزید یہ کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے مل کر جدید ترین ہتھیاروں سے اس کو اتنا مسلح کر دیا کہ وہ تمام عربوں کی متحدہ طاقت کو شکست دینے کے قابل ہو گیا۔ اس کی آبادی

۲۷ لاکھ سے زیادہ نہیں ہے، اور اس کے مقابلہ میں جو عرب ملک اس کے چاروں طرف واقع ہیں اُن کی آبادی ۵ کروڑ ہے۔ لیکن تازہ جنگ میں چاردن کے اندر لڑائی کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ یہ اندازہ کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ پچھلے ۱۹ سال کے دوران میں ان مغربی ملکوں نے اُس کو کتنے بڑے پیمانے پر ہتھیار مہیا کیے ہیں۔ اِس سے بھی زیادہ صحیح اندازہ کرنے کے لیے ایک نگاہ ذرا پیچھے پلٹ کر دیکھنا چاہیے۔ مئی ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے پر مصر، اردن، عراق، لبنان اور شام نے اس کے خلاف جو جنگ برپا کی تھی وہ آٹھ مہینے تک چلتی رہی اور اس مدت میں یہودیوں نے عربوں سے لڑکر فلسطین کا ۸ ہزار مربع میل علاقہ فتح کیا۔ لیکن ۱۹ سال کے بعد ان ریاستوں کی متحدہ طاقت سے اس کی لڑائی صرف چاردن چلی اور اس میں ۴۲ ہزار مربع میل کا علاقہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا جس کے اندر پورا جزیرہ نمائے سینا، غزہ، اور باقی ماندہ فلسطین شامل ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ مغربی ملکوں نے اسرائیل کو بے تحاشا فوجی امداد دی ہے اور خوب سوچ سمجھ کر اس ارادے کے ساتھ دی ہے کہ اسے عربوں کی متحدہ طاقت کو شکست دینے کے قابل بنایا جائے۔ پھر معاملہ اسی حد تک نہیں رہا، بلکہ عین اِس جنگ سے پہلے بحرِ روم اور بحرِ احمر میں برطانیہ اور امریکہ کے کئی طیارہ بردار جہاز عربوں کے سر پر پہنچ گئے اور انہوں نے اسرائیل کی فضائی حفاظت کا کام اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی پوری ہوائی طاقت کو اس غرض کے لیے آزاد کر دیا کہ وہ عرب ملکوں اور ان کی فوجوں پر تاخت کرنے کے لیے وقف ہو جائے۔

اسرائیل کی کامیابی کے اہم اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنے قیام کے بعد سے اب تک پورے ۱۹ سال وہ ہر قسم کی داخلی کشمکش سے آزاد رہ کر اپنی تعمیر و ترقی کے کام میں لگا رہا ہے۔ اس پوری مدت میں وہاں کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا۔ کسی پارٹی نے دوسری پارٹیوں کو فنا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی ڈکٹیٹر قوم کا واحد نجات دہندہ بن کر نہیں اٹھا۔ کسی نے کسی کو غدار یا عربوں کا ایجنٹ یا کسی عرب طاقت کا تنخواہ دار قرار نہیں دیا۔ دنیا کے سو مختلف ملکوں سے یہودی سو مختلف زبانیں بولتے ہوئے وہاں آئے۔ ان کی عادات، روایات، رسوم، سب ایک دوسرے سے بے انتہا مختلف

تھیں۔ ان کے درمیان یہودیت کے سوا کوئی چیز مشترک نہ تھی اور مذہبی حیثیت سے بھی وہ یہودیت کے بہت سے مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے بھی ان کے درمیان متعدد پارٹیاں اپنے اپنے مختلف نظریات اور پروگرام رکھتی تھیں، اور معاشی حیثیت سے بھی ان کے درمیان مفادات کا اچھا خاصا تصادم موجود تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ مل جل کر پورے امن کے ساتھ ایک جمہوری نظام چلاتے رہے، اور انتخابات کے ذریعہ سے بڑی سہولت کے ساتھ یہ فیصلہ کرتے رہے کہ کس وقت کس پارٹی کو اکثریت کا اعتماد حاصل ہے جسے ملک کا نظم و نسق چلانا چاہیے۔ ۱۹۶۵ء میں بن گوریان جیسے مقبول عام قومی لیڈر کی پارٹی کو موجودہ وزیر اعظم اشکول کی پارٹی نے انتخابات میں شکست دی اور بلا کسی مزاحمت کے اقتدار اس کی طرف منتقل ہو گیا۔ تازہ جنگ سے ذرا پہلے اشکول نے دوسری پارٹیوں کو ساتھ ملا کر متحدہ قومی کابینہ بنائی اور جنرل موشے دایان کو وزیر جنگ کا منصب سپرد کر دیا، حالانکہ وہ اس کا سیاسی رقیب اور بن گوریان کی پارٹی کا نمایاں ترین فرد ہے اور اشکول کے خلاف نہایت تلخ تنقیدیں کرتا رہا ہے۔ باہمی تعاون کی اس پُر امن فضا میں اسرائیل نے پچھلے ۱۹ سال کے دوران میں اپنی صنعت، زراعت، اور تجارت کو غیر معمولی ترقی دی اپنے معیارِ زندگی کو مغربی یورپ کے معیار تک پہنچا دیا۔ ایشیا اور افریقہ میں اپنے معاشی تعلقات اور سیاسی اثرات کو بڑے پیمانے پر وسیع کیا اور دنیا کی رائے عام پر نہ صرف اپنی بلکہ پوری یہودی قوم کی دھاک بٹھا دی۔

اس ساری مدت میں ہمارے ہاں جو کچھ ہوتا رہا اس کی داستان بیان کرنے کی آخر کیا حاجت ہے؟ متعدد عرب ممالک پے در پے جن انقلابات سے دوچار ہوتے رہے، جس طرح ان کی طاقتیں آپس ہی میں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہوتی رہیں، جس طرح انہوں نے ایک دوسرے کی حکومتوں کے تختے الٹنے کی کوششیں کیں، اور جس طرح وہ ایک دوسرے کو بدنام کرنے کے لیے گندے اور زہریلے پروپیگنڈے کرتے رہے، ساری دنیا اس کا تماشا دیکھتی رہی ہے۔ دشمن اس پر ہنستے رہے ہیں، اور مسلمان اس پر خون کے آنسو روتے رہے ہیں۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ عین اُس وقت جبکہ اُن کی آنکھوں کے سامنے دشمن اپنے سارے اختلافات کو نظر انداز کر کے یہودیت

پر مجتمع ہو رہے تھے، اور جبکہ دنیا بھر کے مسیحی ان یہودیوں کو حضرت عیسیٰ کا خون معاف کر کے ان کی حمایت کا بیڑا اٹھا رہے تھے، بعض عرب ملکوں میں خود اپنے بھائیوں کے خلاف عقائد اور نظریات کی جنگ برپا کر دی گئی اور اُس کا سلسلہ دشمن کے حملے کا خطرہ سر پر منڈلاتے دیکھ کر بھی نہ رُکا۔

جنگ کا آغاز ہونے سے دو چار روز پہلے فوری طور پر عرب ریاستوں کے درمیان اتحاد کی جو شکل پیدا ہوئی، وہ جیسی کچھ مؤثر اور مفید ہو سکتی تھی اس کا اندازہ ہر شخص خود کر سکتا ہے جنگ شروع ہونے تک بھی اس خیال کی مزاحمت کی جاتی رہی کہ عرب سربراہ ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے مقابلہ کے لیے کوئی متفقہ منصوبہ بنائیں۔

مغربی طاقتوں نے ۱۹۵۵ء سے ہی عربوں کو اس بات سے مایوس کر دیا تھا کہ وہ اپنی فوجی طاقت مضبوط کرنے کے لیے ان کے ہاں سے ہتھیار پا سکیں گے۔ بعض عرب ریاستوں کو اگر امریکہ، برطانیہ، یا فرانس سے کچھ ہتھیار ملے بھی تو بہت ناپ تول کر انتہائی بخل کے ساتھ ملے۔ اس حالت میں بیشتر عرب ملک اس بات کے لیے مجبور ہو گئے کہ ہتھیار حاصل کرنے کے لیے روس اور دوسرے اشتراکی ملکوں کی طرف رجوع کریں۔ علاوہ بریں وہ روس ہی تھا جس کی مداخلت سے ۱۹۵۶ء میں مصر کو برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کے مشترکہ حملہ سے نجات نصیب ہوئی تھی۔ اِن وجوہ سے عرب ممالک میں ایک طرف سوشلزم کا زور بڑھتا چلا گیا اور دوسری طرف وہ زیادہ سے زیادہ روس کی مدد پر انحصار کرنے چلے گئے۔ تازہ جنگ کے موقع پر عربوں کو پُورا اعتماد تھا کہ اگر امریکہ اور برطانیہ نے اسرائیل کی حمایت کی تو رُوس اُن کی مدد کے لیے آجائے گا۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ روس کی مداخلت کا خوف اِن دونوں مغربی طاقتوں کو جنگ میں اسرائیل کی مدد کرنے سے باز رکھے گا اور تنہا اسرائیل سے اگر ان کی متحدہ طاقت کا مقابلہ ہو تو وہ بآسانی اس کو شکست دے سکیں گے۔ لیکن ان کے یہ اندازے بالکل غلط تھے اور جنگ کے موقع پر اُن کا غلط ہونا پوری طرح ثابت ہو گیا۔ جو لوگ حالات پر نگاہ رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس وقت سے کیوبا کے معاملہ میں روس نے امریکہ کے مقابلے میں مونچھیں نیچی کی ہیں، رُوس کی طاقت کا بھرم ختم ہو چکا ہے اور یہ امرِ اب یقینی

ہے کہ جس معاملہ میں امریکہ لڑنے کا عزم لے کر آگے بڑھے گا اس میں روس کبھی مقابلے پر نہ آئے گا۔ عرب سیاست دانوں کو یہ غلط فہمی لاحق رہی کہ حالات اب بھی وہی ہیں جو ۱۹۵۶ء میں تھے حالانکہ وہ بالکل بدل چکے ہیں۔ اب انہوں نے خود دیکھ لیا کہ امریکہ اور برطانیہ نے کھلم کھلا اسرائیل کی مدد کی، اور روس بس دُور سے دھمکیاں دیتا رہا، بلکہ سلامتی کونسل میں وہ جنگ بندی کے لیے ٹھیک وہی قرارداد لے آیا جو اسرائیل کے مفاد میں تھی نہ کہ عربوں کے مفاد میں۔

عرب لیڈروں کو برسوں سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ جس خطرے سے وہ دوچار ہیں اس کا مقابلہ تنہا عرب قومیت نہیں کر سکتی بلکہ اس کے لیے تمام دنیا کے مسلمانوں کی متحدہ طاقت درکار ہے۔ فلسطین کا مسئلہ محض عربوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ پورے عالمِ اسلامی کا مسئلہ ہے۔ عرب ریاستیں اگر غیر عرب ریاستوں سے الگ اپنی ایک مستقل حیثیت اختیار کریں، اور پھر آپس میں بھی وہ اس طرح بٹ جائیں کہ کسی کا تعلق مشرقی بلاک سے ہو اور کسی کا مغربی بلاک سے، تو اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لیکن ان باتوں کو انہوں نے کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اسلام کی بنیاد پر اتحاد کے تصور کی وہ مزاحمت کرتے رہے۔ اور خود عربوں کے درمیان سوشلسٹ اور غیر سوشلسٹ، ترقی پسند اور رجعت پسند، انقلابی اور غیر انقلابی کی تفریق کرکے انہوں نے کوئی متحدہ عربی طاقت بھی نہ بننے دی۔ ان کی سیاست کے تین ستون تھے جن پر وہ آج تک اپنے سارے منصوبوں کی بنا رکھتے رہے ہیں۔ ایک عرب قومیت، دوسرے اشتراکی نظام، تیسرے روس اور اشتراکی بلاک کی حمایت پر اعتماد۔ موجودہ جنگ نے ان تینوں ستونوں کو مسمار کرکے رکھ دیا ہے اور اب صرف وہی شخص ان پر ازسرِنو کسی پالیسی کی بنا رکھ سکتا ہے جو تجربات سے سبق سیکھنے کی کوئی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ کاش اب بھی یہ بات ان کی سمجھ میں آجائے کہ نجات کا راستہ صرف اسلام ہے۔ ان کے حقیقی دردمند و خیرخواہ دنیا میں صرف مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ اور غیروں پر اعتماد کرنے کے بجائے انہیں خدا کے بھروسہ پر عالمِ اسلامی کی ایک متحدہ طاقت بنانی چاہیے۔

اب فوری توجہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ اُن اثرات و نتائج کا مقابلہ کیا جائے جو اس جنگ میں

اسرائیل کی کامیابیوں سے رُونما ہوئے ہیں اور جن کے آئندہ رونما ہونے کا خطرہ ہے۔ اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر قبضہ کرلیا ہے، اور وہ کھلم کھلا کہہ رہا ہے کہ یہ شہر جس میں ایک یہودی بھی موجود نہ تھا، اب اِس بنا پر اُس کے قبضے میں رہنا چاہیے کہ اُس نے لڑکر اسے حاصل کیا ہے۔ وہ پُورے باقی ماندہ فلسطین پر قابض ہوگیا ہے جہاں ایک یہودی بھی نہ تھا اور دس لاکھ مسلمان آباد تھے۔ اب وہ مار مار کر مسلمانوں کو وہاں سے نکال رہا ہے اور ان کی جگہ یہودیوں کو لاکر بسا رہا ہے۔ اُس کے وزیراعظم، وزیرخارجہ اور وزیر دفاع علانیہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے جو علاقے فتح کیے ہیں انہیں ہم واپس نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ دنیا میں پھر ایک مرتبہ یہ قاعدہ نافذ کروانا چاہتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم سے لڑکر اگر اس کا ملک فتح کرلے تو وہ حقِ فتح کی بنا پر اس کی مالک بن جائے گی۔ اقوامِ متحدہ کے منشور کی یہ کھلی خلاف ورزی ہے جو وہ کرنا چاہتا ہے، اور امریکہ و برطانیہ نے اس کے مقابلے میں بالکل چپ سادھ رکھی ہے۔ اس مقصد میں اگر اسرائیل کامیاب ہوجائے تو معاملہ صرف فلسطین اور سینا پر ختم نہ ہوگا بلکہ مزید قدم وہ اردن، شام، مصر اور سعودی عرب کی طرف بڑھائے گا اور اسی قاعدے کو وہاں بھی نافذ کیا جائے گا کہ جو جو علاقے وہ لڑکر حاصل کرتا جائے وہ اس کی ملکیت بنتے جائیں۔ اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اس کی فتوحات کے معنی صرف اتنے ہی نہیں ہیں کہ ایک ملک پر وہ قابض ہو جائے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ اس ملک کے اصل باشندوں کو فنا کرکے یا جلاوطن کرکے ان سے زمین خالی کرائے اور ان کی جگہ دنیا بھر سے یہودیوں کو لاکر بسائے۔

اِن خطرات کا مقابلہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ تمام مسلمان حکومتیں اس وقت پُورے عزم اور پُورے اتفاق کے ساتھ آگے بڑھ کر عرب ریاستوں کا ساتھ دیں، اور دنیا کی تمام دوسری انصاف پسند حکومتوں کی تائید بھی اِس ایک اصولی بات کو تسلیم کرانے میں صرف کردیں کہ کسی جنگی کارروائی کے ذریعہ سے ایک قوم کو دوسری قوم کے ملک پر قبضہ کرنے اور تلوار کے زور سے سرحدوں میں تغیر و تبدل کرانے کا حق نہیں ہے۔ اس معاملے میں اگر مسلمان حکومتوں نے ذرّہ برابر بھی غفلت کی تو اس کا بہت بُرا خمیازہ ایک نہ ایک وقت ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔

مگر ہمیں اس فوری مسئلے کے علاج کی فکر پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ آگے کے لیے کوئی مستقل لائحہ عمل بھی اختیار کرنا چاہیے جو اس ہزیمت کے دُور رس اثرات اور اس کے بنیادی اسباب کا تدارک کر سکے۔ اس جنگ کو خواہ کوئی عرب اور یہود کی جنگ کہے اور اس میں عربوں کی ہزیمت کو صرف عربوں ہی کی ہزیمت قرار دے، مگر فی الحقیقت اس نے تمام دنیا کے مسلمانوں کی عزت، ان کے وقار، اور ان کی سلامتی کو صدمہ پہنچایا ہے۔ اس میں بیت المقدس پر یہودیوں کا تسلط اور مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا خطرہ صرف عربوں ہی پر نہیں، دنیا بھر کے مسلمانوں پر ایک کاری ضرب ہے جس کی ٹیس کو ہر مومن اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، کیونکہ بیت المقدس صرف عربوں ہی کا نہیں، سارے ہی مسلمانوں کا قبلۂ اوّل ہے۔ پھر یہ بھی صاف نظر آ رہا ہے کہ اب یہودیوں کے جارحانہ توسیعی عزائم حرمین شریفین کا رُخ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے جو تنہا عربوں کے لیے ہی نہیں، دنیا کے ہر مسلمان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اِن وجوہ سے اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا کی تمام مسلمان حکومتیں اسرائیل کے مسئلے میں براہِ راست دلچسپی لیں۔ عرب قومیت کے علمبرداروں نے ۲۰ سال تک اسے صرف اپنا مسئلہ بنائے رکھا اور غیر عرب مسلمان بھی مطمئن رہے کہ وہ اس سے خود نمٹ لیں گے۔ لیکن اب ایک طرف یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ اس سے نمٹنے میں ناکام رہے ہیں، اور دوسری طرف ان کی ناکامی کا خمیازہ صرف وہی نہیں بلکہ سارے مسلمان بھگت رہے ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ بھی یہ مسئلہ تنہا انہی کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے اور غیر عرب مسلمان خدانخواستہ ان کی تیسری ہزیمت کا عظیم تر خمیازہ بھگتنے کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔

ہمارے نزدیک اس مقصد کے لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے غیر عرب مسلم ریاستیں باہم تبادلۂ خیال کر کے خود اپنے درمیان اس امر پر اتفاق کریں کہ انہیں سرسری طور پر نہیں بلکہ پوری سرگرمی کے ساتھ اس مسئلے سے دلچسپی لینی ہے۔ اس کے بعد انہیں عرب ریاستوں سے بات چیت کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ تمام مسلم ریاستوں کے سربراہوں کی ایک کانفرنس میں شرکت

کے لیے تیار رہوں ۔ ہمیں امید ہے کہ بحالاتِ موجودہ وہ سب اس تجویز کو بتامّل یا بلا تامّل قبول کر لیں گی ۔ تاہم اگر ان میں سے کوئی اسے قبول نہ بھی کرے تو اس کے لیے دروازہ کھلا رکھ کر ایسی کانفرنس اس کی شرکت کے بغیر ہی جلدی سے منعقد ہونی چاہیے ۔ اس میں جن امور کی طرف خاص طور پر توجہ کی جانی چاہیے وہ یہ ہیں :

۱ ۔ مسلم معاشرے میں عقائد و نظریات کی جنگ برپا کرنا اور اسے اس حد تک بڑھانا کہ ایک نظریے کے حامی دوسرے نظریات کے حامیوں کو طاقت سے کچلنے پر تُل جائیں ، سخت خطرناک حرکت ہے ۔ اس کا ارتکاب عام حالات میں بھی نہ ہونا چاہیے ، کجا کہ یہ عین اس حالت میں کیا جائے جبکہ دشمن دروازے پر دستک دے رہا ہو ۔ اس کا فائدہ کسی نظریے کے حامیوں کو بھی نہیں پہنچ سکتا بلکہ آخر کار صرف دشمن ہی اس سے مستفید ہو سکتا ہے ۔ اس سلسلے کو تمام مسلمان ریاستوں میں قطعی طور پر بند ہونا چاہیے اور یہ بات اصولی طور پر طے ہو جانی چاہیے کہ جس نظریے کے حامی بھی کسی وقت برسرِ اقتدار ہوں وہ نہ اپنا نظریہ دوسروں پر زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کریں گے اور نہ دوسرے نظریات کے حامیوں کو سیدھے سیدھے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے سے روکیں گے ۔

۲ ۔ مسلم ریاستوں کا باہم ایک دوسرے کے خلاف پروپگنڈا کرنا ، یا ایک دوسرے کے ملک میں اندرونی انقلاب برپا کرنے کی کوششیں کرنا ، یا ایک ریاست کا دوسری ریاست کے معاملات میں سیاسی یا فوجی مداخلت کرنا بھی قطعاً ممنوع ہونا چاہیے ۔ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کا فائدہ بھی آخر کار دشمن ہی کو پہنچتا ہے ۔

۳ ۔ اس حقیقت کو خلوصِ دل کے ساتھ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ مسلمانوں کی اصل طاقت اسلام اور اس کے لیے جہاد کا جذبہ ہے ۔ کوئی نیشنلزم یا سوشلزم یا سیکولرزم مسلمانوں میں نہ زندگی کی طاقت پیدا کر سکتا ہے ، نہ مسلم عوام میں رُوحِ جہاد اُبھار سکتا ہے ۔ اِن نظریات کو باہر سے درآمد کر کے مسلم معاشرے میں رائج کرنے اور اس کے لیے حکومت کے ذرائع استعمال کرنے کا

حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مسلمانوں میں پرانے مذہبی تفرقوں پر چند نئے تفرقوں کا اضافہ کیا جائے، ان کی طاقتوں کو آپس کی کشمکش میں ضائع کیا جاتے، اور پھر کسی جنگ کے موقع پر دشمن سے ہزیمت اٹھا کر اس کا خمیازہ بھگتا جائے۔ ان نظریات کو اختیار کرنے کا ایک مہلک نتیجہ یہ بھی ہے کہ یہ مسلمانوں کو اسلامی اخوت پر جمع ہونے سے روکتے ہیں اور ان کو متفرق طور پر اپنے اپنے قومی مفاد یا نظریاتی لگاؤ کی بنیاد پر دنیا کے متحارب بین الاقوامی جتھوں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں، درانحالیکہ ان جتھوں میں سے کوئی بھی ان کے بُرے وقت پر کام آنے والا نہیں ہے، جیسا کہ حالیہ جنگ نے ثابت کر دیا ہے۔ اس لیے اب مسلمان مملکتوں کو یکسو ہو کر اسلام اور اسلامی اخوت پر جمع ہو جانا چاہیے۔

۴۔ مسلمان ریاستوں کو اپنی ایک بین الاقوامی عدالت وجود میں لانی چاہیے تاکہ وہ بروقت ان کی باہمی نزاعات کا تصفیہ کرے، اور ایک معاہدے کے ذریعہ سے سب کو اس بات کی پابندی قبول کرنی چاہیے کہ وہ اس عدالت کے فیصلوں پر عملدرآمد کریں گی۔

۵۔ ان کو اپنا ایک بین الاقوامی مانیٹری فنڈ قائم کرنا چاہیے جس میں وہ سب اپنے ملی وسائل کو مجتمع کریں اور مغربی یا مشرقی بلاک کی مالی امداد سے بے نیاز ہونے کی کوشش کریں۔

۶۔ ان کو باہم معاشی تعاون کے لیے بھی کوئی ایسا نقشہ بنانا چاہیے جس سے ان کے وسیع ذرائع و وسائل ان کی مجموعی ترقی کے لیے استعمال ہو سکیں، ان کی صنعت و تجارت فروغ پا سکے، اور ان کی معاشی قوت مستحکم ہو سکے۔

۷۔ ان کو جلدی سے جلدی اپنی ایک بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی قائم کرنی چاہیے جو مسلمان ملکوں کو ایک دوسرے کے حالات سے بروقت آگاہ کر سکے۔ بحالاتِ موجودہ ہمیں خود مسلمان ملکوں کے حالات اُن خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں جو سیاسی ہی نہیں، مذہبی تعصبات کی بنا پر بھی ہمیں غلط معلومات دیتی ہیں اور صحیح حالات پر پردہ ڈالتی ہیں۔ ان میں سے اکثر ایجنسیوں پر یہودیوں کا غلبہ ہے اور وہ ان کے ذریعہ

سے علانیہ صیہونی پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

۸۔ ان کو اسلحہ کے معاملہ میں دوسروں کی محتاجی سے چھٹکارا پانے کی بلاتاخیر کوشش کرنی چاہیے۔ دنیا میں کہیں سے اگر ہتھیار بلاشرط خریدے جا سکتے ہوں تو وہ ضرور لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا کلی انحصار دوسروں پر نہ ہونا چاہیے کہ وہ جو کچھ دیں، اور جن ظاہری و باطنی شرائط کے ساتھ دیں، اور جو فائدہ بھی وہ ضمناً اپنی اس عنایت کے ذریعہ سے حاصل کریں، ہم بہر حال انہیں قبول کرنے پر مجبور رہوں۔ یہ صورتِ حال جب تک برقرار رہے گی، کوئی مسلمان ریاست بھی اپنی سالمیت کا تحفظ اپنے بل بوتے پر نہ کر سکے گی۔

۹۔ ان کے مدبرین اور فوجی ماہرین کو پورے غور و خوض کے ساتھ دفاع کا ایک جامع منصوبہ بنانا چاہیے اور کسی ایک طاقت کے ہاتھ میں یہ فیصلہ نہ چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ کسی وقت بطورِ خود ایسے اقدامات کر بیٹھے جن کے بُرے نتائج کم و بیش سب کو بھگتنے پڑ جائیں۔

یہ وہ کم سے کم امور ہیں جن کے لیے مسلمان ریاستوں کے سربراہوں کا اجتماع وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اور یہ صرف ہمارا ہی احساس نہیں ہے بلکہ باہر کے مسلمان اہلِ فکر بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ اِس وقت مسلمان ملکوں میں سے اگر کوئی ملک اس معاملہ میں پیش قدمی کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے تو وہ پاکستان ہی ہے۔ خدا کے فضل سے عرب ریاستیں بھی اس کو اپنا سب سے زیادہ ہمدرد و خیر خواہ سمجھتی ہیں، اور غیر عرب ریاستوں میں بھی وہی سب سے زیادہ ان سے قریب تر ہے۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کی رہنمائی فرمائے اور ان کو صحیح کام کرنے کی توفیق بخشے اور دشمنوں کے اس ہجوم میں ان کو اُن کے حال پر نہ چھوڑ دے۔

[اس مقالہ کا صرف ابتدائی حصّہ ملک کے اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ پورا مقالہ ان صفحات میں درج کیا گیا ہے]

اسلامی قانون تعزیرات

(۲)

حدودِ شرعیہ

از : ڈاکٹر عبدالعزیز عامر

ترجمہ : معروف شاہ شیرازی

شراب نوشی قرآن کریم صراحت کے ساتھ شراب کو حرام قرار دیتا ہے :

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَ	شراب اور جُوا اور بُت اور پانسے ناپاک کام اعمالِ
الْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَا	شیطان سے ہیں سو اُن سے بچتے رہنا
جْتَنِبُوهُ ۔	(المائدہ : ۹۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حجۃ الوداع کے موقع پر جب شراب کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا " شراب بذاتِ خود حرام ہے اور وہ تمام پینے کی چیزیں جن سے نشہ ہو ۔" امام مالک نے ابن شہاب زہری سے اور انہوں نے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ " رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بتع[1] اور نبیذ عسل کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا " ہر وہ مشروب جو نشہ دے ، حرام ہے ۔" امام مسلم نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر خمر حرام ہے [2]"

یہ اور اس جیسی بہت سی اور نصوص شراب کی حرمت میں وارد ہیں ۔ لہٰذا یہ جرم بذاتِ خود کتاب و سنت کا منصوص علیہ جرم بن جاتا ہے اور کسی کے لیے اس کی حرمت میں شک کی گنجائش

---

[1] بتع اس شراب کو کہتے ہیں جو گندم اور جَو سے بنائی جاتی ہے ۔

[2] بدایۃ المجتہد ، ابنِ رشد ، جز اص ۳۴۲ اور اس کے بعد ۔ احکام القرآن للجصاص جز ۲ ص ۲۲۴

نہیں رہتی۔ نیز اس میں بھی اختلاف نہیں ہے کہ انگوروں سے جو شراب تیار ہوتی ہے اس کی ہر مقدار حرام ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر۔ البتہ نبیذوں کے معاملہ میں اختلاف ہے۔ ان میں بھی اس حد تک تو اتفاق ہے کہ ان کی جس مقدار سے نشہ پیدا ہو وہ حرام ہے۔ لیکن اُس تھوڑی مقدار کے حکم میں اختلاف ہے جو نشہ آور نہیں ہے۔ حجاز کے جمہور فقہاء اور اکثر محدثین کا یہ خیال ہے کہ وہ بھی حرام ہے۔ اور عراقیوں میں سے ابراہیم النخعی، سفیان ثوری، ابن ابی لیلیٰ، شریک، ابن شُبرُمہ اور ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ انگوروں کے سوا دوسرے مشروبات میں نشہ حرام ہے اصل شئے حرام نہیں ہے[1]۔

یہاں تک جو بحث کی گئی ہے وہ جرم شراب نوشی کے متعلق تھی۔ رہی اس کی سزا تو قرآن کریم میں اس کے لیے کوئی مقررہ سزا بیان نہیں ہوئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت ہے کہ آپ نے شراب کی سزا میں کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ لیکن آپ شراب نوش کو کسی خاص سزا کے تعیّن کے بغیر جوتوں، اور کپڑے کی سونٹیوں اور کھجور کی شاخوں سے پٹواتے تھے۔ سنن ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ کے پاس ایک شخص لایا گیا جس نے شراب پی تھی۔ آپ نے فرمایا "اسے پیٹو"۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی اسے ہاتھ سے مارتا تھا، کوئی جوتوں سے مارتا تھا اور کوئی اپنے کسی کپڑے سے مارتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسے ملامت کرو"۔ چنانچہ لوگ اسے کہنے لگے "کیا تو اللہ سے نہیں ڈرتا"۔ "تجھے اللہ کا خوف نہیں"۔ "تجھے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی حیا نہ آئی"۔ اس کے بارے میں ابن فرحون کہتے ہیں کہ یہ زبان سے تعزیر ہے۔ نیز اس سے یہ استدلال بھی کیا جاتا ہے کہ حد کے ساتھ تعزیر جمع ہو سکتی ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ صحابہ کے اندازے کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مارنے کی تعداد چالیس ضرب تھی۔ نیل الاوطار میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوش

---

[1] اس بارے میں ہر فریق کے دلائل کے لیے ملاحظہ ہو معین الحکام ص ۱۰۹، ۱۸۰۔ بدایۃ المجتہد۔ ابنْ رشد جزء اص ۳۸۲ اور اس کے بعد۔ اور جزء ۲ ص ۳۷۰، ۳۷۱۔ الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۲۱۶۔ الاحکام السلطانیہ ابو یعلیٰ ۲۵۲۔ احکام القرآن للجصاص جزء اص ۳۲۴۔ نیل الاوطار للشوکانی جزء ۷ ص ۵۰۔

کو کھجور کی دو شاخوں کے ساتھ قریباً چالیس ضربات لگوائیں۔ حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب میں جوتوں سے چالیس دفعہ پٹوایا، پھر حضرت عمرؓ نے جوتے کی جگہ کوڑے کر دیئے۔ ایک دوسری روایت میں حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوشی کے جرم میں چالیس ضربات لگوائیں۔ امام شافعیؒ اسی روایت پر عمل کرتے ہیں۔ سائب نے بیان کیا ہے کہ شراب نوش کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی عہد میں ہاتھوں، چادروں اور جوتوں سے مارا جاتا تھا۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے چالیس کوڑے کر دیئے اور جب لوگ زیادہ فسق و فجور کرنے لگے تو اسی کر دیئے۔

ان روایات کی بنا پر شراب نوشی کی سزا کے بارے میں جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ اس کی سزا اسی کوڑے ہے۔ اور امام شافعیؒ، ابو ثور، اور داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ حد چالیس کوڑے ہے۔ جمہورؒ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب لوگ شراب نوشی کا جرم زیادہ کرنے لگے تو آپ نے صحابہ کرام سے اس جرم کی سزا کے بارے میں مشورہ کیا۔ بعض صحابہ نے رائے دی کہ اس کی سزا اسی کوڑے کر دی جائے اور اسے حدِ قذف پر قیاس کر لیا جائے۔ اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول روایات میں آیا ہے کہ "جب وہ شراب پیتا ہے تو آپے میں نہیں رہتا، اور جب آپے میں نہیں رہتا تو ہذیان بکتا ہے اور جب ہذیان بکتا ہے تو افترا پردازی کرنے لگتا ہے۔" اس مشاورت کے بعد حضرت عمرؓ نے اس کی حد اسی کوڑے مقرر کر دی جبکہ وہ پہلے اِس جرم میں چالیس کوڑے لگوایا کرتے تھے۔ دوسرے فریق کا استدلال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوشی میں کوئی خاص حد مقرر نہیں کی بلکہ اس پر بلا تعین مار پیٹ ہوتی تھی جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ صحابہ نے حضور کی مار کو اندازاً چالیس سمجھا اور ایک روایت میں بھی ہے کہ آپ نے چالیس کوڑے مارے[1]۔

[1] معین الحکام ص ۱۷۹، ۱۸۰۔ بدایۃ المجتہد، ابن رشد جزء ۲ ص ۳۷۱۔ تبصرۃ الحکام، ابن فرحون، برحاشیہ فتح العلی المالک جزء ۲ ص ۲۶۶ طبع اول مطبع امیریہ بولاق مصر سنہ ۱۳۰۰۔ الاحکام السلطانیہ، الماوردی

مندرجہ بالا بحث کی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شراب نوشی کی سزا کو چالیس کوڑوں سے اسّی کوڑے کرنا حضرت عمرؓ کا فعل ہے جو آپ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام کے مشورے سے کیا[۱]۔ اسی وجہ سے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ کو اسّی کوڑے حد مقرر کرنے کا مشورہ دیا تو فرمایا "یہ وہ حد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کی رائے سے تجویز ہوئی"۔ اب اگر اُن روایات کا اعتبار کیا جائے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں اِس جرم پر کوئی معین سزا نہیں دی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضورؐ کے زمانے میں شراب پر کوئی حد مقرر نہ تھی بلکہ صرف تعزیر تھی، کیونکہ شرعی اصطلاح میں غیر معین سزا کو تعزیر کہا جاتا ہے۔ اور اگر ان روایات کا اعتبار کیا جائے جن میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں یہ سزا چالیس کوڑے مقرر تھی جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں تو پھر یہ سزا حد قرار پائے گی نہ کہ تعزیر۔ پھر جب صحابہ کے زمانہ میں چالیس سے زیادہ ضربات تجویز کی گئیں، تو یہ زائد ضربات حد نہیں بلکہ تعزیر ہونگی، اور امام کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر حدود کے ذریعہ سے لوگوں کو جرائم کے ارتکاب سے باز نہ رکھا جاسکے تو وہ حدود پر تعزیر کا اضافہ کرسکتا ہے۔

ارتداد | مسلمان ہونے کے بعد کافر ہوجانے کو ارتداد کہتے ہیں، خواہ اسلام کو چھوڑ کر مرتد کوئی دوسرا دین اختیار کرلے، یا کوئی دین بھی اختیار نہ کرے[۲]۔

قرآن کریم میں اس کے متعلق فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ	اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے اور کافر ہی مرے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و

ص ۲۱۶۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ ۲۵۳۔ نیل الاوطار، الشوکانی جزء ۷ ص ۱۹۔

[۱] موجودہ زمانے کے قانونی طرزِ بیان کے مطابق یہ گویا ACT OF PARLIAMENT تھا (مترجم)

[۲] تبصرۃ الحکام، ص ۱۸۶۔ الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۵۱-۵۲۔ المغنی، ابن قدامہ، جزء ۱۰ ص ۷۴۔

اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (البقرہ ۲۱۷) آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے "مَنْ بَدَّلَ دينه فاقتلوه (جو مسلمان اپنے دین کو بدل دے اسے قتل کر دو)۔ جب حضور نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو اس موقع پر انہیں ہدایت دیتے ہوئے حکم دیا کہ وہ مرتد مرد اور مرتد عورت کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے بعد بصورت انکار اس کی گردن اڑا دیں۔ علاوہ بریں بکثرت صحابہ سے قتل مرتد کی روایات منقول ہیں، مثلاً حضرت ابوبکر، حضرت عمرؓ، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم۔ اور کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اس طرح قتلِ مرتد پر اجماع بھی منعقد ہو گیا۔[۱]

ان دلائل سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ارتداد کا جرم قرآن اور سنت کا ایک منصوص جرم ہے اور اس کے جرم ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ نیز یہ کہ اس جرم کی سزا بھی سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔

مرتد اگر کچھ افراد ہوں جو دارالاسلام میں حاکم وقت کی دسترس میں ہوں تو ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے ارتداد کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر یہ پتہ چلے کہ انہیں دین میں کوئی شبہ لاحق ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتد ہوئے ہیں تو دلائل و براہین سے اُن پر حق واضح کرنا چاہیے اور انہیں موقع دینا چاہیے کہ وہ کفر سے باز آجائیں۔ اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور وہ اسی طرح مسلم تصور ہوں گے جس طرح پہلے تھے۔

مرتد سے توبہ کرانے کے مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ بہت سے فقہاء کے نزدیک مرتد کو سزا دینے سے پہلے اس کے سامنے توبہ کی پیش کش واجب ہے۔ امام مالک، ثوری، اوزاعی اور اصحاب الرائے کا یہی مسلک ہے۔ امام شافعی اور امام احمد سے بھی ایک ایک قول اسی کی

[۱] بدایۃ المجتہد، ابنِ رشد ج ۲ ص ۳۰۲۔ المغنی، ابن قدامہ ج ۱۰ ص ۷۴۔ احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۲۰۶۔ نیل الاوطار شوکانی، جلد ۷، ص ۹۸، ۱۰۰۔

تائید میں منقول ہے۔ امام مالک یہ فرماتے ہیں کہ جو شخص خفیہ طور پر بے دینی میں مبتلا ہو کر مرتد ہو جائے اس کو سزا دینے سے پہلے توبہ کرانے کی کوشش ضروری نہیں ہے الا یہ کہ توبہ کی ابتدا اس کی جانب سے ہو۔ باقی تمام مرتدین کو توبہ کا موقع دیا جائے گا جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ امام احمد سے ایک دوسری روایت یہ ہے کہ مرتد کے سامنے توبہ کی پیش کش واجب نہیں ہے بلکہ یہ صرف مستحب ہے۔ امام شافعی کا بھی دوسرا قول یہی ہے۔ ان کا استدلال اس حدیث سے ہے کہ جس نے اپنا دین بدلا اسے قتل کر دو۔ اس میں توبہ کی پیش کش کا ذکر نہیں ہے لیکن وہ لوگ جو توبہ کی پیش کش کو ضروری سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب مرتد عورت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے قتل کرنے کا حکم دیا تھا اس کے بارے میں آپ نے حکم دیا تھا کہ اس سے توبہ کرائی جائے اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ اس مقدمہ میں توبہ کا موقع دینے کے بعد اسے قتل کر دینے کا حکم دیا گیا تھا[1]۔ جو شخص اپنے ارتداد پر اصرار کرے اس کا قتل مذکورہ بالا دلائل کی بنا پر واجب ہے[2]۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا اسے بلا تاخیر قتل کر دیا جائے یا اس کو کچھ مہلت دی جائے؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے بلا تاخیر قتل کر دیا جائے تاکہ اللہ کا حق مؤخر نہ ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اسے تین دن کی مہلت دی جائے، شاید کہ اسے توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے۔ اس آخری رائے کے حق میں اس واقعہ سے استدلال کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے مستور دعجلی کو تین دنوں تک توبہ کرنے کی مہلت دی تھی اور اس کے بعد اسے قتل کیا تھا[3]۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مرتد کو تین دنوں کی مہلت دینے میں مصلحت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دنوں میں وہ اپنے دل میں سوچ لے اور حق کی طرف لوٹ آئے۔ یہ احتمال کہ وہ حق کی طرف لوٹ آئے گا، میرے نزدیک مہلت کی رائے کو راجح کر دیتا ہے خصوصاً جبکہ مہلت کی صورت

[1] بدایۃ المجتہد، ابنِ رشد، ج ۲ ص ۳۸۳۔ المغنی، ابن قدامہ ج ۱۰ ص ۷۴۔ الاحکام السلطانیۃ، الماوردی ص ۵۲۔

[2] الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۵۲

[3] الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۵۲

یعنی اختتام مہلت کے بعد اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کے سزا سے بچ نکلنے کا کوئی موقع نہیں ہے لہٰذا مہلت دینے میں کوئی نقصان نہیں ہے جبکہ اس میں مصلحت بھی ہے۔

عورت اگر مرتد ہو تو اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا مرد کی طرح اسے بھی قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ ارتداد کے حکم میں مرد اور عورت بالکل برابر ہیں۔ یہ رائے حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، امام مالک، لیث، شافعی اور امام احمد کی ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اسے قتل نہ کیا جائے بلکہ قید کر دیا جائے اور اسلام کی طرف پلٹ آنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسلام پر مجبور کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے قید کیا جائے اور ہر دن قید سے نکال کر اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے۔ اگر وہ انکار کرے تو اسے کچھ کوڑے لگائے جائیں اور پھر قید کر دیا جائے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رکھا جائے یہاں تک کہ وہ اسلام کے دائرے میں واپس آجائے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ حدیث ہے کہ جنگ میں عورت کو قتل نہ کیا جائے۔ امام صاحب نے مرتد ہونے والی مسلمان عورت کو اس عورت سے مشابہ قرار دیا ہے جو ابتدا سے کافرہ ہو لیکن جمہور کی دلیل یہ حدیث ہے کہ "جس نے اپنے دین کو بدلا اسے قتل کر دو۔" نیز یہ حدیث کہ "سوائے تین صورتوں کے کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں ہے۔ شادی شدہ زانی۔ قاتلِ نفس اور دین کو چھوڑنے والا جس نے جماعتِ مسلمہ سے جدائی اختیار کر لی ہو۔" اور حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ حضورؐ کے عہد میں ایک عورت مرتد ہو گئی۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کے سامنے توبہ کی پیشکش کی جائے۔ اگر وہ باز آجائے تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔ مزید برآں عورت بھی مرد کی طرح ایک شخصِ مکلّف (RESPONSIBLE PERSON) ہے۔ اس نے اگر دینِ حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کر لیا تو واجب ہے کہ جس طرح اس حالت میں مرد کو قتل کیا جاتا ہے اسے بھی قتل کیا جائے[1]۔

---

[1] معین الحکام ص ۱۸۶۔ بدایۃ المجتہد، ابنِ رُشد جزدوم ص ۳۸۳۔ الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۵۲ المغنی، ابن قدامہ جز ۸ ص ۲۴، ۵،۔

میرے نزدیک ارتداد کے معاملہ میں مرد اور عورت کے درمیان فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اس معاملہ میں جمہور کے پیش کردہ دلائل مضبوط ہیں اور مرتدہ کو اصلی کافرہ پر قیاس کرنا بھی درست نہیں ہے۔

بغاوت فقہاء باغیوں کی تعریف یوں کرتے ہیں "وہ لوگ جو امام کے خلاف خروج کریں، جماعت کی مخالفت کریں، اپنا ایجاد کردہ الگ مذہب اختیار کریں، ایسا کرنے کے لیے ان کے پاس دلائل پر مبنی تاویل ہو، اور انہیں مقابلہ کی قوت اور شوکت بھی حاصل ہو"[۱]

باغیوں کے بارے میں جو نصوص وارد ہیں ان میں سے ایک یہ آیت ہے:-

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا	اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں
فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا	تو ان میں صلح کرا دو اور اگر ایک فریق دوسرے پر
عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ	زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک
إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا	کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع لائے۔ پس جب وہ
بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ	رجوع لائے تو دونوں فریق میں مساوات کے
الْمُقْسِطِينَ[۲]	ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو۔ اللہ

[۱] الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ ص ۳۸۔ الشرح الکبیر، جزء ۱۰، ص ۴۹ اور اس کے بعد، طبع المنار ۱۳۴۸ھ۔ التشریع الجنائی الاسلامی مقارناً بالقانون الوضعی۔ استاذ عبد القادر عودہ، جزء اول، القسم العام طبع اول ۱۳۶۸ھ، ۱۹۴۹ء ص ۱۰۰ اور اس کے بعد، نیز ص ۶۶۲ تا ۶۶۳۔

[۲] حجرات، آیت ۹۔ اس آیت کی شان نزول کے بارے میں یہ آیا ہے کہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا حتیٰ کہ انہوں نے ہاتھوں اور جوتوں سے ایک دوسرے کو مارا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان لین دین پر جھگڑا ہوا۔ ایک نے کہا کہ میں زبردستی اپنا حق لے لوں گا کیونکہ اس کا خاندان زیادہ زور آور تھا۔ دوسرے نے کہا میرا اور تیرا فیصلہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے۔ آخر کار دونوں میں ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ دونوں گروہوں سے مراد

انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

حضرت انس اور حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری اُمت میں اختلاف و افتراق ہو گا۔ ایسے لوگ پیدا ہونگے جو بات اچھی کرینگے لیکن ان کے اعمال خراب ہوں گے۔ وہ دین سے اُسی طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار کے جسم سے پار ہو جاتا ہے، وہ اس وقت تک رجوع نہ کریں گے جب تک تیر اپنے سوفار کی طرف واپس نہ آجائے۔ یہ لوگ بدترین مخلوقات میں سے ہوں گے، خوش خبری ہے اُن لوگوں کو جو اُن کو قتل کریں یا اُن کے ہاتھوں قتل ہوں۔ وہ لوگوں کو خدا کی کتاب کی طرف بلائیں گے، حالانکہ ان کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ جو شخص ان کو قتل کرے گا وہ ان کی بہ نسبت اللہ کے زیادہ قریب ہو گا۔" اَعمش نے خیثمہ سے اور انہوں نے سُوید ابن غفلہ سے حضرت علیؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ کہتے ہوئے سُنا "جب میں آپ لوگوں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کوئی حدیث سناتا ہوں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے لیے یہ آسان ہے کہ میں آسمان سے گر جاؤں اور پرندے میری بوٹیاں نوچ لیں بجائے اس کے کہ میں حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب کروں۔ البتہ اگر ہم آپس میں بات چیت کر رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ جنگ ایک قسم کا دھوکا ہے۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: "آخر زمانے میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گا جو کم عمر اور کم عقل ہو گا۔ وہ لوگ ایسی باتیں کریں گے جو تمام لوگوں کی باتوں سے اچھی معلوم ہوں گی مگر ان کا ایمان ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا۔ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسا کہ تیر شکار کے جسم سے نکل جاتا ہے۔ اگر آپ لوگ اُن سے ملیں تو انہیں قتل کر دیں۔ ان کو قتل کرنے کا اجر ان کے قاتل کو قیامت کے دن ملے گا۔"

... خزرج ہیں۔ ان کے درمیان لاٹھی چل گئی تھی۔ ابوبکر جصّاص کہتے ہیں کہ آیت کے ظاہر الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ حکم دراصل باغی گروہ سے لڑنے کا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ البتہ عمومیت کے ساتھ اس کا اطلاق تمام باہمی لڑائی جھگڑوں پر ہوتا ہے۔ احکام القرآن، جصاص جز ۳ ص ۴۹۹ مطبع الاوقاف الاسلامیہ ۱۳۲۵ھ

صحابہ کرام میں سے کسی نے باغی گروہ کے ساتھ جنگ کرنے سے اختلاف نہیں کیا ہے جبکہ جنگ کے سوا ان پر کوئی اور چیز کارگر نہ ہو رہی ہو۔ خروج کرنے والوں سے لڑنے پر سب کا اتفاق ہے۔[1]

باغیوں کے بارے میں احکام ان کے حالات کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف ہیں:

اگر وہ اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے امام کی اطاعت سے عملاً خروج نہ کریں، نہ کسی خاص علاقے میں جمع ہوں بلکہ ایسے افراد کی طرح رہیں جو ہر وقت امام کی دسترس میں ہوں تو ان سے تعرض کیے بغیر ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا اور حقوق اور حدود میں ان پر اہلِ عدل کے احکام جاری ہوں گے۔[2]

اگر وہ اہلِ عدل کے درمیان رہتے ہوئے اپنے اعتقاد کا علانیہ اظہار کریں تو امام کا یہ کام ہوگا کہ پہلے وہ ان کے عقائد کی غلطی ان پر واضح کرے تاکہ وہ حق بات کو مان لیں اور جماعتِ مسلمہ کے طریقہ کی طرف پلٹ آئیں۔ پھر بھی وہ اپنے غلط عقائد و افکار پر جمے رہیں تو امام کے لیے یہ جائز ہوگا کہ وہ انہیں کوئی ایسی سزا دے جو اس حالت میں وہ ان کے لیے مناسب سمجھے۔[3]

لیکن اگر یہ باغی گروہ اہلِ عدل سے الگ ہو کر کسی خاص مقام یا علاقے میں جمع ہو جائے تو اس صورت میں بھی جب تک وہ کسی حق (OBLIGATION) کی ادائیگی سے انکار نہ کرے اور امام کی اطاعت سے باہر نہ ہو جاتے۔ اس سے جنگ نہ کی جائے گی۔ حضرت علیؓ کے زمانہ

---

[1] احکام القرآن للجصاص، ج ۳ ص ۴۹۱ اور اس کے بعد طبع ۱۳۴۸ھ۔

[2] الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۵۶۔ الاحکام السلطانیہ۔ ابو یعلیٰ ص ۲۸۔ ابو یعلیٰ لکھتے ہیں کہ "خوارج کے کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کا اظہار کیا اور ایک روز جبکہ آپ خطبہ دے رہے تھے، ان میں سے ایک نے نعرہ بلند کیا" لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ"۔ حضرت علیؓ نے فرمایا "یہ بجائے خود حق بات ہے مگر تم اس کے غلط معنی لے رہے ہو۔ تمہارے معاملہ میں ہم تین باتوں کے پابند ہیں۔ ہم تمہیں مساجد میں ذکر اللہ کا ذکر کرنے سے نہ روکیں گے تمہارے خلاف اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا نہ کریں گے اور جب تک تمہارے ہاتھ ہمارے ساتھ ہیں مالِ فے میں تمہارا حصہ دینے سے ہم انکار نہ کریں گے۔

[3] الاحکام السلطانیہ الماوردی ص ۵۶۔ احکام سلطانیہ ابو یعلیٰ ص ۲۸-۲۹۔

میں خوارج کا ایک گروہ الگ ہو کر نہروان میں جمع ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ نے ان پر اپنا ایک عامل مقرر کر دیا جس کی وہ ایک مدت تک اطاعت کرتے رہے اور حضرت علیؓ نے اُن سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ باغی جب تک امام کی اطاعت پر قائم رہیں اُن سے جنگ نہ کی جائیگی خواہ وہ کسی علیحدہ علاقے میں اکٹھے بھی ہو جائیں[۱]۔

لیکن اگر یہ گروہ امام کی اطاعت سے انکار کر دے اور وہ حقوق ادا نہ کرے جو اس پر واجب ہیں، اور خود ٹیکس وصول کرنا اور اپنے احکام جاری کرنا شروع کر دے، تو اس کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنا کوئی امام مقرر کیے بغیر یہ کام کریں۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنا ایک امام بنا لیں۔ اگر وہ کسی امام کے بغیر یہ سب کچھ کرتے ہیں تو اس شکل میں وہ جو اموال لیں گے وہ غصب تصوّر ہوگا اور جن لوگوں سے وہ یہ اموال لیں گے ان کے ذمّہ حکومت کے واجبات باقی رہیں گے۔ اسی طرح ان کی قائم کردہ عدالتیں جو فیصلے کریں گی وہ سب کالعدم ہونگے۔ ان سے کوئی حق ثابت نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنا ایک امام مقرر کر لیتے ہیں اور اس امام کے کہنے پر ٹیکس وصول کرتے ہیں اور اس کی منظوری سے عدالتیں قائم کر کے فیصلے کرتے ہیں تو اس صورت میں لوگ جو ٹیکس ان کو ادا کریں گے اس کا مطالبہ ان سے نہ کیا جائے گا اور ان کی عدالتیں جو فیصلے کر دیں گی وہ کالعدم قرار نہیں دیئے جائیں گے۔ یہ معاملہ تو صرف اموال اور احکام کے بارے میں ہے لیکن دونوں صورتوں میں خواہ وہ امام مقرر کریں یا نہ کریں ان سے جنگ ضرور کی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ دائرہ اطاعت میں واپس آ جائیں[۲]۔

معین الحکام میں ہے کہ جس وقت امام کو یہ اطلاع ملے کہ باغی جنگ کی تیاری کر رہے ہیں اسی وقت اسے اقدام کرنا چاہیے اور انہیں پکڑ کر قید کر لینا چاہیے تاکہ وہ اپنے ارادوں پر عمل ہی نہ کر سکیں۔ کیونکہ شر کو اس کے وقوع سے قبل ہی مٹا دینا زیادہ آسان ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ واقع ہو جائے۔ لیکن اگر امام کو علم نہ ہو اور باغی لشکر اکٹھا کر کے جنگ کے لیے تیار ہو جائیں تو امام کو چاہیے کہ پہلے ان کو حق کی طرف پلٹ آنے کی دعوت دے، اگر وہ مان جائیں تو فبہا، ورنہ ان کے ساتھ لڑنا اور انہیں شکست دینا واجب ہو گا (باقی)

[۱] الاحکام السلطانیہ ابو یعلیٰ ص ۹ ۳ [۲] الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۵۶ - ابو یعلیٰ ص ۳۹ [۳] معین الحکام ص ۱۹۵

رسائل و مسائل

غیر سُودی معیشت میں حکومت کو قرض کی فراہمی کا مسئلہ

سوال - میں آج کل غیر سُودی نظامِ بنک کاری پر کتاب لکھ رہا ہوں۔ اسی سلسلہ میں ایک باب میں حکومت کو قرض کی فراہمی کے مسئلہ پر لکھنا ہے۔ آج کل حکومت کو متعدد وجوہ سے جس وسیع پیمانہ پر قرض کی ضرورت ہوتی ہے اس کے پیشِ نظر صرف اخلاقی اپیل پر انحصار نہ کر کے اصحابِ سرمایہ کو قرض دینے کے کچھ محرکات فراہم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ غیر سُودی معیشت میں جو لوگ حکومت کو قرض کے طور پر سرمایہ فراہم کریں ان کو قرض دیئے ہوئے سرمایہ پر بعض محاصل میں تخفیف، یا بعض محاصل سے استثناء کی رعایت دی جائے۔ مثلاً آمدنی کا جو حصہ بطور قرض حکومت کو دیا جائے اس پر انکم ٹیکس کی شرح رعایتی طور پر کم کر دی جائے۔ یہ رعایت حکومت کے لیے قرض کی فراہمی میں مددگار ہو گی۔

یہاں تک تو اس تجویز کا تعلق ان وضعی محاصل سے تھا جو ایک اسلامی ریاست عشر و زکوٰۃ وغیرہ شرعی محاصلِ واجبہ کے علاوہ عائد کرتی ہے۔ اب ایک بالکل علیحدہ مسئلہ کے طور پر یہ بھی دریافت کرنا ہے کہ اگر مذکورہ بالا رائے کو اختیار کرنے کی آپ گنجائش سمجھتے ہوں تو کیا یہ بھی ممکن ہے کہ جو سرمایہ جتنی مدت کے لیے حکومت کو قرض دیا گیا ہو اس سرمایہ پر اتنی مدت تک قرض دینے والے سے زکوٰۃ نہ وصول کی جائے۔

دونوں تجاویز کے موافق اور مخالف جو دلائل میرے سامنے ہیں ان کا آپ کے سامنے اعادہ کر کے آپ کا قیمتی وقت صرف کرنے کے بجائے صرف اتنا لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ پہلی رائے کے حق میں تو مجھے اپنی حد تک اطمینان ہے کہ اس میں کوئی شرعی اصول پامال نہیں ہوتا۔ مسئلہ صرف عملی

معاملہ کی روشنی میں فیصلہ کا طالب ہے۔ البتہ دوسری رائے پر مجھے اطمینان نہیں ہے۔ دونوں رایوں کے سلسلے میں آپ سے علیحدہ علیحدہ رہنمائی کا طالب ہوں۔"

جواب۔ حکومت کو جو لوگ غیر سُودی قرض دیں ان کو ٹیکسوں میں رعایت دینا تو میرے نزدیک جائز ہے، بشرطیکہ رعایت میں قرض کی مقدار کے لحاظ سے اضافہ نہ ہو، کیونکہ وہ اسے سُود سے مشابہ بنا دیگا۔ رہی زکوٰۃ کی معافی، تو اس کے لیے کوئی دلیل جواز مجھے نظر نہیں آتی۔ اگر رضاکارانہ فوجی یا غیر فوجی خدمات کے بدلے میں نماز معاف ہو سکتی ہو تو غیر سُودی قرض دینے کے بدلہ میں زکوٰۃ بھی معاف ہو سکے گی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو دونوں دینی فریضوں کے معاملہ میں نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بارہا جنگی اور دوسری ضروریات کے لیے لوگوں سے مالی امداد کی اپیل کی گئی۔ مگر کبھی کسی مدد کے بدلے میں بھی کوئی فریضہ ساقط نہیں کیا گیا، نہ کسی فریضہ میں تخفیف کی گئی۔ علاوہ بریں منافع بخش (PRODUCTIVE) اغراض کے لیے جو قرضے حکومتیں لیں ان سے حاصل ہونے والے منافع کو وہ ایک تناسب کے ساتھ ان لوگوں میں تقسیم کر سکتی ہیں جنہوں نے ان کاموں کے لیے سرمایہ دیا ہو۔ یہ صورت اکثر حالات میں اس منافع سے، یا دہ نفع آور ہو گی جس کے لالچ میں لوگ حکومتوں کو سُودی قرض دیتے ہیں۔ اگر کسی خاص منصوبے کے لیے حکومت کوئی مالی مدد لوگوں سے لے تو جب تک یہ روپیہ اس کام میں لگا رہے اس وقت تک اس منصوبے کی آمدنی کا ایک حصہ روپیہ دینے والوں کو ادا کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر عام قرض ہو جسے بہت سے منصوبوں میں استعمال کیا جانا ہو تو اسے بھی قرض کے بجائے مضاربت کے اصول پر لیا جائے اور جن کاموں میں یہ روپیہ استعمال ہو ان کی مجموعی آمدنی سے ایک متناسب منافع ان سب لوگوں کو دیا جائے جنہوں نے سرمایہ فراہم کیا ہے۔

بقیہ اشارات

اور ان کی بندوق کا رُخ یہودیوں کی طرف کہیں اُس وقت جا کر مُڑا جب آغاز جنگ سے چند روز پہلے شاہ حسین نے خود مصر پہنچ کر جمال عبدالناصر کے ساتھ دفاعی اتحاد کا معاہدہ کیا۔

سعودی عرب کے حالات اگرچہ دینی اعتبارات سے مصر اور شام کی بہ نسبت بدرجہا بہتر ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ملک کے فرمانرواؤں نے دین کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے اس کا عشر عشیر بھی انہوں نے نہیں کیا۔ ان پر دین کا سب سے زیادہ حق تھا، کیونکہ سعودی خاندان کو دین ہی کی بدولت اقتدار نصیب ہوا۔ ان کو اللہ نے حرمین شریفین کی خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ ان پر اس نے دولت کی وہ بارش کی جو کبھی ان کے اور کسی عرب کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ لیکن پچھلے ۲۰ سال کے دوران میں مغربی تہذیب ایک سیلاب اور طوفان کی طرح ان کی مملکت میں پھیلتی رہی اور اسے روکنے کے لیے کوئی مؤثر تدابیر اختیار نہیں کی گئیں۔ اس ملک کو دنیائے اسلام میں تقدس کا جو مقام حاصل ہے اس کی بنا پر وہ بڑی آسانی کے ساتھ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک رہنما قوت بن سکتا تھا۔ لیکن اس معاملے میں اس نے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی وہ کوشش نہیں کی جو وہ فی الواقع کر سکتا تھا۔ ایک طرف محلاتی سازشوں اور رقابتوں کی وجہ سے مال اور وقت کا بڑا حصہ ضائع ہوتا رہا۔ دوسری طرف خدا کی دی ہوئی دولت کو بے دریغ عیش و عشرت اور شان و شوکت پر صرف کیا جاتا رہا۔ اور جو ذرائع و وسائل ملک کی معاشی اور فوجی طاقت کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال ہونے چاہییں تھے وہ اسراف و تبذیر کی نذر ہوتے رہے۔

اسی نمونے پر آس پاس کی ان چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کے شیوخ بھی چل پڑے جن کی زمین پے در پے تیل کی دولت اگلتی رہی۔ ان کی شاہ خرچیوں کی جو تفصیلات یورپ کے اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں، دشمن ان کا مذاق اڑاتے رہے ہیں اور مسلمانوں کی گردن شرم سے جھکی جاتی رہی ہے۔

ان چیزوں کو پڑھ کر آدمی یہ سوچنے لگ جاتا ہے کہ اس قسم کی مُسرفانہ عادات کے ساتھ کیا کوئی قوم دنیا میں زیادہ دیر تک زندہ رہ سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین میں تیل کے چشمے رواں کیے جن سے بے تحاشا دولت اُبل رہی ہے۔ مگر اس دولت سے اللہ کے دین کی آبیاری کرنے اور اپنی معاشی و فوجی طاقت بنانے کے بجائے اسے عیاشیوں میں بے دریغ بہایا جا رہا ہے۔ جس شیخ کا جب جی چاہتا ہے دو دو ہزار خدام اور خادماؤں کے ساتھ یورپ کا رُخ کر لیتا ہے اور وہاں ایک ایک دن میں لاکھوں روپے صرف ہوٹلوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ان ممالک کی دولت کا بیشتر حصہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں خرچ ہوتا ہے اور وہاں کے دولتمند یہودی اسی مال کو پھر اسرائیل کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ بنک آف انگلینڈ کا تو استحکام ہی کویت کا رہینِ منت ہے۔

افسوس! جو ۲۰ سال کی مہلت اللہ تعالیٰ نے عربوں کو دی تھی وہی اس نے اسرائیل کو بھی عطا کی تھی۔ اس مدت میں اسرائیل اپنی سیاسی، معاشی اور فوجی قوت بناتا چلا گیا۔ اور عرب اپنی قوتیں کچھ نفس پروری میں اور کچھ نمائشی کاموں میں، اور کچھ آپس کی کشمکش میں ضائع کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ ان کی بغل میں بیٹھا ہوا دشمن کیا تیاریاں کر رہا ہے، کتنی طاقت اس نے فراہم کر لی ہے، اور کیا اسباب ہیں جو اسے طاقتور بنا رہے ہیں۔

یہ تو ہیں ان ممالک کے دینی اور سیاسی حالات۔ جہاں تک ان کے فہم و بصیرت کا تعلق ہے اُس کے متعلق بھی کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ہر ملک نکمے کھلاڑی کی طرح خود نمائی کے جذبے میں سرشار اکیلا سکور کرنے کے درپے ہے۔ اُسے دنیائے اسلام یا دنیائے عرب کے مسائل سے زیادہ اپنی قیادت و سیادت قائم کرنے کی فکر دامنگیر رہتی ہے اور اس نشہ نے بعض ممالک میں جنوں کی سی کیفیت اختیار کر لی ہے۔ اس بنا پر وہ کوئی ایسی بات خواہ وہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، سننے پر آمادہ نہیں ہوتے جس سے اُن کی قیادت اور برتری کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ اگر پوری دنیائے اسلام ایک صحیح بات پر متفق ہوتی نظر آتی ہو تو یہ اُس کی مخالفت کرنا اپنا فرض منصبی خیال کریں گے۔ ہم یہاں

اس کی ایک دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔

سعودی عرب کی طرف سے شاہ فیصل نے مسلمانوں کے اتحاد کی تحریک شروع کی اور اس سلسلے میں عرب اور مسلمان ریاستوں کو بعض ایسے مفید مشورے دیئے گئے جن سے سب کو بہت زیادہ فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ اُن سے کہا گیا کہ مسئلہ فلسطین کو صرف عربوں کا مسئلہ بنانے کے بجائے دنیائے اسلام کا مسئلہ بنایا جائے تاکہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ممالک کی تائید حاصل کی جاسکے۔ تمام مسلمان ممالک کے لیے اقتصادی لحاظ سے جامع منصوبہ بندی کی جائے اور باہمی تعاون سے ان سارے ممالک کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ پھر ثقافتی اور مذہبی معاملات میں مسلمانوں کے لیے ایک مشترکہ لائحۂ عمل تیار کیا جائے اور مغربی تہذیب کی یلغار کو متحد ہو کر روکا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ اس تحریک میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے کسی مسلمان ملک کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ مگر مصر اور شام دونوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور لوگوں کو یہ باور کرانے کے لیے پورا زور صرف کر دیا کہ یہ سب کچھ مغربی استعمار کے اشارے پر کیا جا رہا ہے اور یہ تحریک سامراجیوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے اٹھائی گئی ہے بعینہٖ یہی پروپیگنڈا ماسکو سے بھی اتحاد عالم اسلامی کے خلاف کیا جا رہا تھا۔

پھر دیکھیے کہ تمام عرب ممالک ۱۹۶۵ء تک عرب سربراہوں کی کانفرنس کا کسی حد تک احترام کرتے رہے اور اس وجہ سے ان کا کچھ تھوڑا بہت بھرم قائم رہا۔ آخری کانفرنس ۱۹۶۵ء میں کاسابلنکا کے مقام پر ہوئی اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسرائیل کے خلاف کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام عرب ممالک اپنے داخلی اختلافات ختم کر کے اور پوری طرح متحد ہو کر سرگرم عمل ہوں لیکن اس فیصلے کے فوراً بعد ہی مصر اور شام کی طرف سے اسے ٹھکرایا جانے لگا۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں جب اسرائیل نے اردن کی بستی السموع پر حملہ کیا تو تمام عرب ملکوں نے اس کی مذمت کی مگر انہیں یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ وہ ایک جگہ سر جوڑ کر کوئی متفقہ راہ عمل اختیار کر سکیں۔

اسی کاسابلنکا کانفرنس کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جب اس میں کشمیر کے بارے میں

قرارداد منظور کی جانے لگی تو مصر نے شدید مخالفت کی۔ وہ تو بھلا ہو شاہ فیصل، عبدالسلام عارف مرحوم اور شاہ حسین کا کہ انہوں نے اس موقع پر بڑی جرأت مندی کا ثبوت دیا اور اس قرارداد کو کسی نہ کسی طرح پاس کروا لیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جمال عبدالناصر صاحب مسلمان ملکوں کے ساتھ یک طرفہ ٹریفک چلانا چاہتے ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آئے تو سب مسلمان ان کی مدد اور حمایت کریں مگر جب کسی مسلمان ملک پر مصیبت آئے تو وہ ان کے حق میں ایک کلمۂ خیر بھی نہ فرمائیں۔ اس سے بڑھ کر تدبر کا دیوالیہ پن اور کیا ہو سکتا ہے۔

اسرائیل مشرق وسطیٰ کو ہڑپ کر جانے کے لیے ... دست تیاریاں کر رہا تھا اور وہ اسلحہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے علاوہ دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک کو اپنا مؤید بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہا تھا۔ مگر مشرقِ وسطیٰ کے بدنصیب ممالک کا یہ حال تھا کہ عین اُس وقت بھی جبکہ جنگ کے شعلے ہر وقت بھڑکنے کے لیے تیار تھے، ان کی کوئی مشترکہ کانفرنس نہ کی گئی، ان کا کوئی متحدہ لائحۂ عمل نہ بنایا گیا، اور ان کی فوجوں کے درمیان تعاون و توافُق کی کوئی صورت پیدا نہ کی گئی۔ مصر اور شام دوسروں کے تعاون سے بے نیاز ہو کر خود ہی اسرائیل کا مقابلہ کرنے کا دم داعیہ لیے بیٹھے رہے، اور دنیا کو یہ لاف زنی سناتے رہے کہ ہم چار گھنٹوں میں اسرائیل کا تیاپانچا کر کے رکھ دینگے۔ اُردن کے شریف اور وسیع الظرف فرمانروا نے خود مصر جا کر دستِ تعاون دراز کیا۔ سعُودی عرب نے بھی خود آگے بڑھ کر امداد کی پیشکش کی۔ سوڈان الجزائر، اور مراکش نے بھی خود اپنی فوجیں روانہ کیں۔ مگر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ عین آغاز جنگ کے وقت جہاں مختلف ممالک کی فوجیں یکایک اکٹھی ہو جائیں وہاں کوئی معرکہ آخر کیسے سر کیا جا سکتا ہے۔

دنیائے اسلام کا کوئی ملک ایسا نہیں جس نے اس معاملے میں مشرقِ وسطیٰ کی پُوری پوری حمایت نہ کی ہو۔ خصوصاً ترکی نے تو اس معاملے میں اسلامی اخوت کا بہت بڑا مظاہرہ کیا اور اپنی ساری تلخیاں بھول کر عربوں کے موقف کی تائید کی۔ اسی طرح ایران نے بھی اس بات کو بُھلا دیا کہ آغازِ جنگ تک اسے گالیاں دی جاتی رہی تھیں اور اس پر اسرائیل کی مدد کے الزامات لگائے جاتے رہے تھے۔ اسلامی اخوت کا تقاضا

کرکے اس نے یہ سب کچھ فراموش کر دیا اور عربوں کی کھلم کھلا حمایت کی۔ مگر اس شخص کی دانائی و ہوشمندی کی داد کس طرح دی جائے جس نے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کے دوست اور خیر خواہ اگر ہو سکتے ہیں تو مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ وہ دوستوں کو ٹھکراتا رہا اور اس روس پر بھروسا کرتا رہا جس نے عین وقت پر دغا دیکر دکھا دی۔

ایک طرف نہ صرف عرب ممالک بلکہ پوری دنیائے اسلام امداد کے لیے بیتاب تھی مگر دوسری طرف یہ عالم تھا کہ کسی ایک جگہ مل بیٹھ کر صلاح مشورے کے لیے بھی آمادگی نہ پائی جاتی تھی اور اس مہم کو صرف روس کی امداد کے بھروسے پر سر کرنے کا ارادہ کیا جا رہا تھا۔ تمام مسلمان ممالک سے مشاورت تو خیر بڑی بات ہے کرنل ناصر صاحب کی انانیت نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ صرف عرب ممالک ہی سے مشورہ کر کے کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کر لیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روس پر اندھے اعتماد نے انہیں ہر دوسری قوت سے بالکل بے نیاز بنا دیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ تنہا یہ معرکہ سر کر کے ہیرو بن جائیں۔ حد یہ ہے کہ لڑائی شروع ہو جانے کے بعد جب سارے ممالک نے از خود حق و انصاف اور اسلامی اخوت کے تقاضوں کے پیشِ نظر اپنے سارے اختلافات ختم کر کے ناصر صاحب کی سربراہی میں اسرائیلی جارحیت کا مقابلہ شروع کیا تو اس وقت بھی انہوں نے اُن کی کسی تجویز یا مشورے کو قبول نہ کیا۔ مراکش اس موقع پر بار بار یہ کہتا رہا کہ عرب سربراہوں کی کانفرنس بلا کر کوئی مشترکہ منصوبہ تیار کر لیا جائے مگر اس کی بالکل شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر ۸ - جون کو عرب وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس کویت میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا مگر ظاہر ہے کہ یہ باتیں بعد از وقت تھیں۔

دورِ جدید میں جنگ کرنے اور پھر اُسے کامیابی کے ساتھ جیتنے کے لیے دوسرے تقاضوں کے علاوہ ایک نہایت ضروری تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ اپنے موقف کی صحت کے بارے میں پوری دنیا کو آگاہ کریں اور نشر و اشاعت کے وسیع ذرائع استعمال کر کے دنیا کی رائے عام کو مطمئن کر دیں کہ آپ برسرِ حق ہیں اور آپ کا دشمن سراسر زیادتی کر رہا ہے۔ اس غرض کے لیے یہ ضروری تھا

کہ دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں تفصیل کے ساتھ بہت بڑے پیمانے پر فلسطین کے اصل مسئلے کو پیش کیا جاتا۔ یورپ، امریکہ، ایشیا، افریقہ، غرض ہر براعظم کے عوام کو بتایا جاتا کہ ایک قوم کے وطن میں زبردستی دوسری قوم کا وطن پیدا کر کے کتنی بڑی زیادتی کی گئی ہے۔ ناقابلِ انکار حقائق سامنے لا کر یہ ثابت کر دیا جاتا کہ اسرائیل کا وجود بجائے خود ایک ظلم اور جارحیت ہے جسے دفع کرنے میں عرب بالکل حق بجانب ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں بھی عربوں کا پروپیگنڈا بہت کمزور رہا ہے اور یہودیوں نے اپنے پروپیگنڈا کے زور سے کم از کم غیر مسلم دنیا کی رائے عام کو اتنا متأثر کر لیا ہے کہ وہ ان ظالموں کو الٹا مظلوم، اور عرب مظلوموں کو اُلٹا ظالم سمجھنے لگی ہے۔ عرب صرف عربی زبان میں نشر و اشاعت کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا مقدمہ دنیا کے سامنے بخوبی رکھ دیا ہے۔ حالانکہ انگریزی، جرمن، فرنچ اور دنیا کی دوسری بڑی زبانوں میں ان کا پروپیگنڈا یہودی پروپیگنڈے کے مقابلے میں ایک فی صد بھی نہیں ہے۔

اس جنگ میں دنیائے اسلام نے بلا شبہ بہت کچھ کھویا ہے۔ غزہ اور جزیرہ نمائے سینا، دریائے اردن کے مغرب میں فلسطین کا وہ پورا علاقہ جو ۱۹۴۹ء میں بچا رہ گیا تھا، قدیم بیت المقدس اور بحیرہ طبریہ کے مشرق اور شمال کا اچھا خاصا علاقہ یہودیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ ہزارہا خاندان تباہ و برباد ہوئے۔ بے حساب ساز و سامان کا نقصان ہوا۔ اور نہ صرف عرب بلکہ پوری دنیائے اسلام کے وقار اور ساکھ کو شدید صدمہ پہنچا۔ بے شک یہ ایک بڑا المناک سانحہ ہے لیکن اگر یہ ہولناک نتائج دنیائے اسلام کی آنکھیں کھولنے کا باعث بن سکیں تو پھر بھی ہم یہ سمجھیں گے کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑا۔ قوموں پر ایسے حادثات آتے ہی رہتے ہیں اور انہیں اس قسم کے نقصانات برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ شکست فتح کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اگر وہ اس سے عبرت حاصل کر کے اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا کریں اور اپنے دوست اور دشمن کے درمیان تمیز کر کے اپنے معاملات کو سلیقے، صبر، عزم و ہمت اور اتحاد کے ساتھ طے کرنے کے ڈھنگ سیکھ سکیں۔

اوّلاً، اس بحران نے اس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہوئے بغیر کوئی چارہ

نہیں۔ اسلامی اخوت کا رشتہ ہی سب سے زیادہ پائیدار اور مضبوط ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرے سب رشتے تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ ترکی، پاکستان، ایران، افغانستان اور دوسرے غیر عرب مسلمان ممالک نے جس طرح سے عربوں کا ساتھ دیا ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلامی اخوت میں اب بھی بے پناہ طاقت موجود ہے۔ ہمیں قوت و طاقت کے اس اتھاہ خزانے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

دوسرے، اس جنگ نے اس حقیقت کو بھی پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ کفر کے اپنے گھر میں خواہ کتنے شدید اختلافات ہوں، مگر اسلام اور مسلمانوں کی بربادی کے معاملے میں اُن کے اندر کامل اتفاق اور اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک پر بھی بھروسا کرنا بُری نا عاقبت اندیشانہ روش ہے۔ مغربی الحاد اور اشتراکیت، امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس خواہ آپس میں کتنے ہی دست و گریباں ہوں مگر اسلام کی مخالفت میں بالکل متفق اور متحد ہیں۔

تیسرے، مسلمانوں کے اندر نہ تو کوئی ایسی آئیڈیالوجی مقبول ہو سکتی ہے جو اسلام سے متصادم ہو اور نہ کوئی ایسا نظریہ پنپ سکتا ہے جو دین کی ضد ہو۔ جو دین ایک قوم کے رگ و پے میں سرایت کر کے اُس کی جڑیں نہایت گہری اتار چکا ہو اُسے محض قوت کے بل بوتے پر اکھاڑ پھینکنے کی کوشش بہت بڑی حماقت ہے۔ اسلام آج بھی اس ملت کی قوت و طاقت کا واحد سرچشمہ ہے۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو فکر و عمل کی کوتاہی کے باوجود اس پر اب بھی اعتقاد ہے۔ اس عظیم قوت کو نظر انداز کر کے باطل نظریات کو فروغ دینا بالکل پاگل پن ہے۔ چنانچہ اس وقت پوری دنیائے اسلام کی نجات اسی میں ہے کہ جس دین کے ساتھ وہ غیر شعوری محبت اور عقیدت رکھتے ہیں اس کے ساتھ اُن کا شعوری اور ارادی تعلق پیدا کیا جائے اور اُس کے تقاضوں کے مطابق نہ صرف انہیں زندگی بسر کرنے کی تلقین کی جائے بلکہ اس کے لیے انہیں مناسب ماحول اور سازگار فضا مہیا کی جائے۔

چوتھے، قدرتی وسائل کے اعتبار سے مسلمان قوم کوئی غریب اور مفلس قوم نہیں ہے کہ دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کیے بغیر اس کا زندہ رہنا ناممکن ہو۔ اس ملت کو اللہ تعالیٰ نے بڑے

قیمتی ذرائع و وسائل دیتے ہیں۔ اس بنا پر اس کا فرض ہے کہ باری تعالیٰ کے ان عطیات کو اُس کے احکام کے مطابق استعمال کرے اور انہیں ایک مخصوص طبقہ کی میراث سمجھ کر اس کی عیش پرستیوں کے لیے انہیں مختص نہ کر دے۔

ان اصولی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مختلف ممالک کے اندر ایسی قیادت کو اُبھارا جائے جو مسلمانوں کی ملی امنگوں کی پُوری طرح ترجمان ہو اور اس کے دینی تقاضوں کو پُورا کرنے کا عزم اور ارادہ رکھتی ہو۔ غیر دینی نظریات کو پروان چڑھانے کے لیے جو لوگ طاقت کے بل بوتے پر برسر اقتدار آ جاتے ہیں وہ اس ملت کی کوئی ٹھوس خدمت نہیں کر سکتے بلکہ قوم کی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کے بجائے انہیں باہمی سر پھٹول میں ضائع کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

مسلمانوں کو نشر و اشاعت کے لیے ایک مضبوط ملی ادارے کے قیام کی بھی فکر کرنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے موقف سے دنیا کو صحیح طور پر آشنا نہیں کر سکتے۔

چراغ راہ کا سوشلزم نمبر عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے۔ یہ نمبر جس کے لیے چوٹی کے ملکی، غیر ملکی مفکرین کا تحریری تعاون حاصل کیا گیا ہے، انشاء اللہ اپنے موضوع پر ایک یادگار دستاویز ہو گا۔ اس نمبر کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے:

حصہ اوّل :۔ اشتراکیت کا علمی مطالعہ۔ حصہ دوم : اشتراکی تحریک۔

حصہ سوم : اشتراکیت عمل کی تجربہ گاہ میں۔ حصہ چہارم : بین الاقوامی جائزے۔

حصہ پنجم : اشتراکیت اور اسلام۔ حصہ ششم۔ اشتراکیت اور ادب

حصہ ہفتم : اشتراکیت اپنوں اور دوسروں کی نظر میں حصہ ہشتم : اشتراکی لٹریچر۔

حصہ نہم :۔ مسائل کا حقیقی حل۔

مجوزہ ضخامت : ۵۰۰ صفحات ۔ قیمت : ۶ روپیہ ۔ سالانہ خریداروں کے لیے رعایتی قیمت : ۳ روپیہ۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

مِلّتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ

(حصہ اوّل)

مولفہ :- ثروت صولت

- بعثت نبوی سے عباسی دورِ حکومت تک کے مستند حالات۔
- مسلمانوں کے شاندار ماضی کی صحیح ترین عکاسی۔
- اِسلامی نقطۂ نظر سے تمدنی، سیاسی، معاشرتی اور صنعتی حالات کی تفصیل اور بے لاگ تجزیہ۔
- آسان زبان میں تاریخ ملّی کا ایسا جامع تذکرہ جو ضخیم کتابوں سے بے نیاز کردے۔
- نادر تصاویر، نایاب نقشوں سے مزیّن۔
- مِلّت کے عروج وزوال کا عبرت انگیز مرقع۔

صفحات ۲۱۲ - قیمت ۳/۷۵ روپیہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکٹ لاہور